

وہ جن نظروں سے دیکھتا ہے، میراجی چاہتا ہے انہی قدموں پر کھڑی کھڑی مر جاؤں۔ ایک ماں کے لیے اس سے بڑی ذلت اور کیا ہوگی کہ اس کے بیٹے کو ظلم ہو کہ اس کی ماں نے اسے چور دروازے پیدا کیا ہے۔

## چور دروازہ

روایت: احمد یار خان

تحریر: عارف محمود



اصولاً اس واردات کی اطلاع لے کر نسر دار کو خود آنا چاہئے تھا۔ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا میں اس گاؤں کے نسر دار کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ہندو تھا اور اس کا نام تلجی رام تھا۔ بہت نیک نام اور فرض شناس انسان تھا۔ اس میں تعصب نام کو بھی نہیں تھا۔ سب مذاہب کے لوگوں سے برابری کا سلوک کرتا تھا۔

میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تلجی رام خود کیوں نہیں آیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ نسر دار کو بخراچہ چاہا ہوا ہے اور وہ لاش کی حفاظت کے لیے دیں موجود ہے۔

بہر حال میں ضروری تیاری کر کے اور وہ کانشیلوں اور ایک ہیڈ کانشیل کو ساتھ لے کر ان کا پڑی تھی، اس کے آس پاس دیہاتیوں کا جھوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ تلجی رام مجھے دیکھتے ہی بڑی تیزی سے آگے آیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے تک لے کر جا کر پر نام کیا۔ میں اس سے تفصیلات پوچھنے لگا۔

اچانک ایک طرف سے ایک عورت کے بلند آواز سے رونے اور بین کرنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ ایک پتہ عمر کی عورت اپنے سینے پر دو ہتھ مار رہی تھی اور لاش کی طرف جانے کے لیے زور لگا رہی تھی۔ ایک مہینے سال کا نوجوان اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نسر دار تلجی رام نے مجھے بتایا کہ یہ مقتول جوہر علی کی بیوہ ہے اور نوجوان مقتول جوہر علی کا بیٹا مظہر علی ہے۔ نسر دار تلجی رام نے بتایا کہ اس بچے کے علاوہ جوہر علی کی دو بیٹیاں ہیں جو دوسرے علاقوں میں بیاہی ہوئی ہیں۔ ان کو اطلاع بھجوا دی گئی ہے۔

لاش گندم کے کھیت کے پانچ چھ گز اندر کی طرف پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مینڈھ تھی۔ اس مینڈھ کے دوسری طرف ایک جھوٹا سا نالہ بنا ہوا تھا جو

اپنی کئی تفتیشی کہانیوں میں بتا چکا ہوں کہ ہمارے زمانے میں قتل کی وارداتیں بہت کم ہوا کرتی تھیں۔ یہ حال نہیں تھا کہ جو آج کل پاکستان میں ہے۔ دن دیہانے قتل، ڈکیتیاں، پورے پورے کنبے کا قتل، سیاسی قتل۔ غرض تھانوں میں وارداتوں کے انبار لگے رہتے ہیں۔ پھر ان حالات میں پولیس کا کارگر اری ایسی ہی ہو گئی جیسی نظر آ رہی ہے۔ ہمارے وقتوں میں وارداتیں کم ہونے کی وجہ سے کسی کیس کی تفتیش کے لیے خاصا وقت لگتا تھا۔

انگریزوں کے دور میں قتل، ڈکیتی وغیرہ کو سنگین وارداتیں سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پولیس کی مشینری آمدنی طوفان کی طرح حرکت میں آ جاتی تھی۔ انگریز افسر تفتیشی افسر پر آپس کی طرح سوار رہتے تھے اور روز مرہ ڈائری چیک کرتے تھے مختصر یہ کہ انگریز اپنے بنائے ہوئے قانون پر خود بھی سختی سے عمل کرتے تھے اور دوسروں سے بھی گراتے تھے۔

جو کہانی سن رہا ہوں اس کا تعلق ہندوستانی پنجاب سے ہے۔ ان دنوں میں شہر کے مضافاتی علاقے کے قرائن میں تعینات تھا۔ میرے تھانے کے زیر اثر خاصا ذبیح علاقہ تھا۔ یہاں ہندو سکھ اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ ان علاقوں میں چھوٹے موٹے جرائم ہوتے ہی رہتے تھے لیکن ڈکیتی یا قتل جیسی سنگین واردات پچھلے ذبیحہ سال سے نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے یہ پُرکھون تھانہ تھا۔

پھر قتل کی واردات آ گئی۔ نزدیکی گاؤں سے تین دیہاتی تھانے میں یہ اطلاع لے کر آئے کہ ان کے گاؤں کے قریب کھیتوں میں ایک آدمی کی لاش پڑی ہے۔ تفصیل پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ مرنے والے کی شناخت ہو گئی ہے اور وہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اس کا نام جوہر علی بتایا گیا۔ یعنی مرنے والا مسلمان تھا۔

لاش کے ساتھ ملنے والی اشیاء سے ایک بات ثابت ہو گئی کہ قتل کی وجہ روپیہ پیسہ ہرگز نہیں ہو سکتی اور نہ ہی یہ راہزنی کا معاملہ ہے۔ قتل کے انداز اور زخموں کی تعداد سے دشمنی ظاہر ہو رہی تھی۔ قتل عام طور پر عورت کی وجہ سے یا زمین جائیداد کے جھگڑے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ میں نے بڑی باریک بینی سے معائنہ کیا تھا مگر مجھے جائے واردات پر کسی عورت کی موجودگی کے آثار نہیں ملے تھے۔

میں نے نقشہ صورت حال مرتب کیا۔ لاش سے ملنے والی اشیاء کا اندراج کیا اور دیگر کاغذی کارروائی کر کے نمبردار تلجارام اور دوسرے معززین سے بطور گواہ دستخط کرائے۔ اس طرح میں نے لاش قانونی طور پر اپنے قبضے میں لے کر نمبردار سے کہہ کر ایک چار پائی اور چادر منگوائی۔ چار پائی آگئی تو لاش کو اس پر ڈال کر چادر سے ڈھک کر پمپھارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ تلجارام نے چار پائی اٹھانے کے لیے اپنے چادر آدی ساتھ کر دیئے تھے۔ میں نے ہینڈ کینسل کو ساتھ بھیج دیا۔

جب وہ لوگ لاش لے کر جانے لگے تو مقتول کی بیوہ اس قدر دردناک انداز میں بین کرنے لگی کہ وہاں موجود سب لوگوں کی آنکھیں بھج گئیں۔ ہم پولیس والوں کو اپنے موقعوں پر اپنا دل چھر کا بنانا پڑتا ہے ورنہ وہ تفتیش نہ کر سکیں۔

بہر حال لاش چلی گئی اور میں نمبردار تلجارام کے ساتھ اس کے کچے مکان کی بیٹھک میں آ بیٹھا۔

بیوی ہار گیا

میں نے مقتول کی بیوہ اور اس کے بیٹے سے بیان لینے سے پہلے ضروری سمجھا کہ نمبردار تلجارام سے مقتول جو ہر علی کے متعلق معلومات لے لوں۔ نمبردار اپنے علاقے کے ہر مرد و عورت کے بارے میں اتنی معلومات رکھتے تھے جتنی ان کو خون اپنے بارے میں بھی معلوم نہیں

کھیتوں تک پانی پہنچاتا تھا۔ اس وقت نالے میں پانی نہیں تھا۔ فردوسی کے آخری دن تھے اور گندم کے پودے خاصے اونچے ہو چکے تھے۔ میں نے کھیت کے اندر جا کر دیکھا، لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔ جہاں لاش پڑی تھی اس کے ارد گرد کی فصل ٹوٹی اور مسلی ہوئی تھی۔ صاف پتہ لگ رہا تھا کہ مقتول نے خاصی محنت کی ہوگی لیکن قاتل یا قاتلوں نے آخر اسے بے بس کر لیا۔

لاش کے ارد گرد خون بہہ بہہ کر جم گیا تھا اور اس پر کھیاں، جھنکار رہی تھیں۔ ارد گرد گندم کے پودوں پر بھی خون کے چھینٹے پڑ کر جھے ہوئے تھے۔ جسمانی ساخت اور قد و قامت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مقتول خاصا صحت مند تھا۔ اس کی کتھنوں پر موجود سفید بالوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ چالیس پینتالیس کے لگ بھگ عمر ہوگی۔

پشت پر کوئی زخم نہیں تھا۔ میں نے دو کینسلوں کی مدد سے لاش کو سیدھا کر کے دیکھا۔ اچھا خاصا خوبصورت آدمی تھا۔ جھگے کپڑے کی بنی ہوئی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھے۔ پیروں میں چمڑے کے مکلیں تھے جو دیہات میں کم لوگ پہنتے تھے۔ اس کے پیٹ پر زخموں کے نشان نظر آرہے تھے۔ میں نے پیٹ پر سے مکلیں ہٹا کر دیکھا۔ چاقو یا فنگر کے چار پانچ زخم تھے۔ ایک زخم تقریباً چار پانچ انچ لمبا تھا۔ سب زخم گہرے تھے۔

لاش کے بائیں ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں فیروزہ جڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے گلے میں ایک تھوڑا سا تاجو چاندی کے خول میں تھا۔ میں نے جیب کی تلاش لی تو کچھ روپے اور سکے نکلے۔ یہ سب چیزیں میں نے اپنے قبضے میں لے لیں۔ پر بڑی باریک بینی سے جائے واردات کا جائزہ لیا مگر کوئی ایسی چیز نہ ملی جو تفتیش میں مدد کر سکتی۔ ہر طرف گندم کی فصل اور گھاس پھوس ہونے کی وجہ سے کھرے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔





اس ٹرک کو تالا لگا رہتا تھا اور اس تالے کی چابی رہی کور نے ایک ڈوری میں پرو کر گلے میں ڈال رکھی تھی۔ آدھی رات کے وقت جب رہی گہری نید سو رہی تھی تو بھوپندر نے بڑی استادی سے اس کے گلے سے چابی نکال لی اور ٹرک کا تالا کھول کر زیور ڈھونڈنے لگا۔ کپڑوں کے اندر چلی تہہ میں زیور اسے مل گیا۔

بھوپندر نے اندھیرے میں نٹول کر یہ ساری کارروائی کی تھی۔ پھر اس نے ٹرک کو دوبارہ تالا لگا دیا لیکن بھوپندر کی قسمت خراب تھی یا اسے شامت اعمال کہہ لیں کہ عین اسی وقت صحن میں دو بلیاں لڑنے لگیں اور بڑی یہ خوفناک آواز میں غراٹے لگیں۔ ان کی آواز سے رہی کور کی آنکھ کھل گئی اور پھر بھوپندر رینگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ رہی کور اسے ننگی گالیاں دیتی رہی اور وہ اس کی منت سماجت کرنے لگا کہ زیور اسے دے دے۔ رہی کور نے بھوپندر سنگھ سے کہا کہ وہ سیدھی طرح بتائے کہ اسے زیور چوری کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی ہے۔ پہلے تو بھوپندر نے ٹالنے کی کوشش کرتا رہا لیکن رہی کور نلنے والی عورت نہیں تھی۔ آخر بھوپندر نے اسے اصل بات بتادی۔

اس کے بعد رہی کور نے بلند آواز سے بولا شروع کر دیا اور ایسی ایسی سنائیں کہ بھوپندر کو شرم سے پسینہ آ گیا۔ ارد گرد کے ہمسائے بھی جاگ اٹھے اور یوں صبح تک سارے گاؤں والوں کو معلوم ہو گیا کہ بھوپندر نے کیا بے غیرتی دکھائی ہے۔

رہی کور نے کہا کہ میں کوئی گانے یا بکری نہیں ہوں کہ بھوپندر نے باپ کا مال سمجھ کر مجھے داؤ پر لگا دیا۔ اگر میرا خاوند بے غیرت ہو گیا ہے تو میں اس سے بڑھ کر بے غیرت بن کر دکھاؤں گی۔ اب میں اس کی ہوں جس نے مجھے جوئے میں جیتا ہے۔

یاروں دوستوں سے ادھار پیسے مانگنے شروع کر دیے مگر اس کے یار دوست بھی مالی لحاظ سے اسی جیسے تھے۔ چار دن گزر گئے تھے اور وہ بہت تھوڑے پیسے جمع کر سکا تھا۔ صرف تین دن باقی رہ گئے تھے اور بھوپندر سنگھ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ مطلوبہ رقم کا انتظام نہیں کر سکے گا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اسے اپنی بیوی ہاتھ سے نٹنی نظر آنے لگی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی گھروالی کے پاس تھوڑا سا زیور پڑا ہوا ہے، اگر وہ اپنا زیور دینے پر آمادہ ہو جائے تو پھر کام بن سکتا ہے۔ رہی کور اپنے زیور کو بہت سنبھال کر رکھتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا خاوند جو اٹھتا ہے اور جواری کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔

جواری ہارتا بھی جاتا ہے اور اس امید پر کھلتا بھی جاتا ہے کہ وہ ایک ہی بازی میں سارا نقصان پورا کر لے گا۔ اسی امید پر وہ اپنی آخری پونجی اور پھر گھر کا سامان بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ بعض بے غیرت اور بے حس جواری اپنی بیوی کو بھی تاش کے پتوں کی جھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

بھوپندر کی بیوی بڑی سخت طبیعت کی عورت تھی۔ اس میں سکھوں والی بے باکی بھی تھی اور وہ منہ پھٹ ہونے کے ساتھ ساتھ جھٹ جھٹ بھی تھی۔ اکثر بھوپندر کو ننگی گالیاں بکیتی تھی اور ہاتھ پائی پر بھی اتر آتی تھی۔ بھوپندر سنگھ اگر اس نے زیور مانگتا تو وہ کبھی بھی نہ دیتی۔ بھوپندر نے اپنی بیوی کا زیور چوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے یہ معلوم تھا کہ اگر بیوی کو یہ بات معلوم ہوگئی تو گھر میں بڑا دلگاہ فساد ہوگا۔ دوسری طرف اس کی عزت غیرت کا مسئلہ تھا۔

بھوپندر بے غیرت نہیں تھا لیکن دیسی شراب کے نشے کی ترنگ میں اپنی عزت غیرت داؤ پر لگا بیٹھا تھا۔ رہی کور نے اپنا زیور ایک جستی ٹرک میں رکھا ہوا تھا۔

اسے لے کر آئے۔

اگرچہ مقتول جوہر علی کے لواحقین مدے کی حالت میں تھے لیکن میرے لیے ان کا بیان لینا ضروری تھا۔ میں نے ماتم والے گھر میں جانا مناسب نہ سمجھا اور ایک آدمی کو بھیجا کہ وہ مقتول کے بیٹے مظہر علی اور اس کی ماں کو یہاں لے آئے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ماں بیٹا آ گئے۔ بیٹا تو حوصلے میں نظر آ رہا تھا لیکن مقتول کی بیوہ کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ غم سے نڈھال نظر آ رہی تھی۔ میں نے دونوں کے ساتھ رسمی انٹرویو کا اظہار کیا اور پہلے مظہر کو بیان کے لیے اپنے پاس بٹھالیا۔

”مقتول جوہر علی کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ بات سارا گاؤں جانتا ہے۔“ مظہر علی نے کہا۔ ”کہ بھوپندر ان کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ یہ اسی کا کام ہے۔“

”بھوپندر کو تمہارے باپ سے کیا دشمنی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی بیوی آوارہ عورت ہے۔“ مظہر علی نے کہا۔ ”میرے باپ کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔“ اس کے بعد اس نے تقریباً وہی بات سنا دی جو پہلے ہی میں نمبردار تلجرام سے سن چکا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ میرے باپ کو بھوپندر نے ہی قتل کیا ہے۔“ مظہر علی نے ساری بات سنا کر کہا۔

”رات تمہارا باپ کہاں تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ جائے واردات تک کیوں گیا تھا۔ کیا رات کوئی اس سے ملنے کے لیے آیا تھا؟“

”رات کو کوئی اس سے ملنے نہیں آیا۔“ مظہر علی نے کہا۔ ”رات کو وہ گھر میں ہی سو رہا تھا، پتہ نہیں کس وقت باہر نکلا۔“

اس کے بعد اس نے بھوپندر کو اپنے قریب آنے اور ہاتھ لگانے سے منع کر دیا۔ پھر رہنی کور نے انتقام جوہر علی سے ایسے تعلقات قائم کر لیے جن کی کوئی بھی مذہب اجازت نہیں دیتا اور جو ناجائز کہلاتے ہیں۔ یہ بھوپندر کی غیرت پر ایسی چوٹ تھی کہ اسے چپ گنگی اور وہ اندر ہی اندر ٹھٹھکنے لگا۔ وہ سرعام کہتا پھرتا تھا کہ جب بھی موقع ملا وہ رہنی کور اور جوہر علی کو قتل کر دے گا۔

بعد میں جوہر علی نے اسے جیت کی رقم معاف کر دی مگر رہنی کور نے بھوپندر کو معاف نہیں کیا تھا۔ وہ سرعام دوسرے مردوں سے دوستیاں لگانے لگی تھی۔ دوسرے لفظوں میں جوش انتقام میں اندھی ہو کر ایسے راستے پر چل پڑی تھی جس کا اختتام ایک مہری کھائی پر ہوتا تھا۔

اس دوران دو تین مرتبہ جوہر علی اور بھوپندر کا جھگڑا بھی ہوا اور نوبت ہاتھ پائی سے ڈانگ سونے تک بھی پہنچی لیکن بھوپندر اس بات سے مار کھاتا تھا کہ اس کی اپنی مرغی خراب تھی جو دوسروں کے ہاں جا کر انڈا دیتی تھی۔ اس کے دل میں جوہر علی کے خلاف دشمنی کچی ہو گئی تھی۔ وہ جوہر علی ہی تھا جس کی وجہ سے اسے اپنی اتنی خوبصورت بیوی سے نہ صرف ہاتھ دھوٹا پڑے بلکہ ہر طرف اس کی بے عزتی اور بے غیرتی کے چرچے ہو گئے۔ یہ تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات تھی۔

عورتوں کا شکاری

تلجرام نے بھوپندر سنگھ کی کہانی سنائی تو مجھے یوں لگا کہ اس نے بھوپندر سنگھ کی صورت میں جوہر علی کے قاتل کو میرے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ دشمنی صاف ظاہر تھی۔ قتل کی وجہ بھی موجود تھی۔ بھوپندر سنگھ اب میرا مشتبہ نمبر ایک تھا۔ میں نے تلجرام سے بھوپندر کے متعلق کچھ اور باتیں پوچھیں اور پھر اس سے کہا کہ وہ اپنا ایک آدمی بھیج کر بھوپندر کو ہمیں بلا لے۔ نمبردار نے ایک آدمی کو بھیجا کہ وہ جائے اور بھوپندر سنگھ جہاں بھی ملے



اخلاق ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا۔ تالا  
کھلا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دکان سونے کی ہے یا  
کوئلے کی۔ (رانا محمد شاہد)

باتیں پوچھ کر اس کی والدہ یعنی مقتول جو ہر علی کی بیوہ کو  
بلا لیا۔ اس سے بھی میں نے وہی باتیں پوچھیں جو مظہر علی  
سے پوچھی تھیں۔ اس نے تقریباً وہی جواب دیئے جو اس  
کا بیٹا مظہر علی دے چکا تھا۔ میاں بیوی دکھ سکھ کے ساتھی  
ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ مقتول کی بیوہ سے کوئی ایسی  
بات معلوم ہو جائے گی جو بیٹے کو معلوم نہ ہوگی۔ مگر مجھے  
اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ وہ بچی شہر پرست عورت  
تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے شوہر کا ساکے ساتھ بہت  
اچھا سلوک تھا، گھر کے باہر وہ کیا کرتا ہے، اس بات سے  
اسے کوئی غرض نہ تھی۔

میں نے دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔  
اب مجھے اس بات کا انتظار تھا کہ جو آدمی بھوپندر سنگھ کو  
لانے کے لیے گیا ہے، وہ آجائے تو میں بھوپندر سنگھ کو  
ساتھ لے کر تھانے چلا جاؤں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ آدمی آگیا جو بھوپندر سنگھ  
کو لینے کے لیے گیا تھا۔ وہ بھوپندر کو لے آیا تھا۔ اس  
نے میرے کہنے پر بھوپندر سنگھ کو میرے سامنے پیش کر  
دیا۔ وہ ویسا ہی سکھ تھا جیسے عام طور پر سکھ ہوتے ہیں۔  
شکل و صورت واجبی تھی مگر بھینسے کی طرح پلا ہوا تھا۔ میں  
نے اسے پہلی نظر دیکھا تو جو خیال میرے دماغ میں آیا،  
وہ یہ تھا کہ اتنے صحت مند جوان آدمی کی بیوی اسے اٹھکرا  
کر تنگی اور سے یار لگا لے تو وہ کسی بھی حد تک جاسکتی ہے،  
قتل تو معمولی بات ہے۔

اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہندوؤں کی طرح مجھے  
سلام کیا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب باقی تفتیش  
تھانے میں جا کر کروں گا۔ میں نے بھوپندر سنگھ سے کوئی

”اس کے علاوہ کسی کے ساتھ کوئی دشمنی یا لڑائی  
جھگڑا؟“ میں نے پوچھا۔

”چھوٹے سونے لڑائی جھگڑے تو چلتے ہی رہتے  
ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن کسی کے ساتھ ایسی  
دشمنی نہیں تھی کہ قتل تک نوبت آجائے۔“  
”سنا ہے، مقتول عورتوں کا شکار تھا۔“ میں نے  
اس سے کہا۔

”اس میں میرے باپ کا تصور نہیں۔“ اس نے  
کچھ ناگواری سے کہا۔ ”لوگ تو بات کا جھگڑنا لینے  
ہیں۔ میرا باپ اونچا لمبا اور خود برو مرد تھا۔ اس کے  
برعکس اکثر ہنوسوٹے، بد شکل یا پھر بالکل ہی مرل  
ہوتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی بیویاں میرے باپ کے  
پیچھے لگی رہتی تھیں اور بدنام کرتی تھیں۔“

وہ آخر بیٹا تھا، اپنے باپ کی حمایت قدرتی بات  
تھی۔

”ایک بات یاد آگئی ہے۔“ مظہر علی نے اچانک  
کہا۔ ”ہو سکتا ہے آپ کے کام کی ہو۔ آج کل میرا  
باپ بہت پریشان رہتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ آڑھت  
کے کام میں بہت نقصان ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلے  
میں منڈی میں موجود چند ہندو آڑھتیوں نے ایسا چکر  
چلایا کہ میرا باپ سمجھ نہ سکا اور گھٹا کھا گیا۔ وہ پیسے کی وجہ  
سے بہت پریشان تھا۔ وہ کہتا تھا کہ پاؤں بٹانے کے  
لیے فوری طور پر خاصی رقم کی ضرورت ہے۔“

میں نے یہ بات اپنے ذہن میں رکھ لی مگر میرا خیال  
تھا کہ کاروبار میں ایسی اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے اور  
کاروباری حریف ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے  
اسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس معاملے کی وجہ  
سے کوئی قتل ہوتا تو وہ جو ہر علی نہ ہوتا بلکہ جو ہر علی کے  
ہاتھ اس کا کوئی کاروباری حریف ہندو قتل ہوتا۔

بہر حال میں نے مظہر علی سے اپنے کام کی کچھ اور

کے زخم بھی جان لیوا حد تک خطرناک تھے۔ مختصر یہ کہ مقتول کی موت کا باعث یہی زخم تھے۔

ادھر ادھر کے کاموں میں رات کے نونچ گئے۔ سردیوں کے دن تھے۔ سرشام ہی اندھیرا گہرا ہو جاتا تھا۔ میں نے بھوپندر سے پوچھ چکھ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک کانشیل سے کہا کہ وہ بھوپندر سنگھ کو حوالات سے نکال کر میرے پاس لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد کانشیل کو دروازے میں کھڑا رہنے کو کہا۔

میں نے بھوپندر سنگھ کو ایک طرف کھڑا کر دیا۔ وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا مگر خوفزدہ نہیں لگ رہا تھا۔  
"تم نے مردوں والا کام کیا ہے بھوپندر؟"۔ میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔  
"اب مردوں کی طرح اپنے جرم کا اقبال بھی کر لو"۔  
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سرکار!"۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "میں کس جرم کا اقبال کر لوں؟..... میں نے آج تک کوئی جرم نہیں کیا۔"

"میں جو ہر علی کی بات کر رہا ہوں"۔ میں نے کہا۔ "اس نے تمہاری غیرت کو لٹکا رہا تھا اور تم نے اسے دنیا کے تختے سے ہی اٹھا دیا..... تمہاری جگہ کوئی بھی غیرت مند ہوتا تو یہی کرتا۔"

"یہ غلط ہے سرکار!"۔ اس نے بھیک مانگتی آواز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "میں نے جو ہر علی کو نہیں مارا۔"

"کیا تم اپنی گھر والی کو جوئے میں نہیں مارے تھے؟"۔ میں نے کڑک کر کہا۔ "کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ اپنی گھر والی اور جو ہر علی کو سو قہ طے ہی قتل کرو گے؟..... تم انکار کرو، پورا گاؤں تمہارے خلاف کو ایسی دے گا۔"

"یہ سب سچ ہے حضور!"۔ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ جو ہر علی کو میں نے

ہمت نہ کی اور کانشیلوں سے کہا کہ بھوپندر کو ساتھ لے کر تھانے چلیں۔

یہ سنتے ہی بھوپندر سنگھ تڑپنے لگا کہ اسے تھانے کیوں لے جایا جا رہا ہے۔ کانشیلوں نے اس سے کہا کہ یہ اسے تھانے جا کر ہی پتہ چلے گا۔ اگر وہ شرافت سے نہیں چلے گا تو پھر وہ اسے جھڑول کرتے ہوئے لے جائیں گے۔ یہ سن کر وہ چپ چاپ ہمارے ساتھ چل پڑا۔

تھانے پہنچ کر میں نے بھوپندر سنگھ کو حوالات میں بند کرنے کا حکم دیا۔ میرا خیال تھا کہ بھوپندر کو ابھی رات تک حوالات میں بند رکھ کے پریشان کیا جائے پھر رات کو اس سے پوچھ چکھ کر دوں گا۔ یہ بھی طزم کو نفسیاتی طور پر توڑنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

صبح سے دوپہر دو بجے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ میں خاصا تھک چکا تھا۔ اس لیے میں نے تھوڑی دیر آرام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

گورو کی قسم! صبح سے دوپہر دو بجے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھ چکھ کر دوں گا۔ یہ بھی طزم کو نفسیاتی طور پر توڑنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔  
تقریباً آدھ پون گھنٹہ آرام کے بعد تازہ دم ہو کر پھر تھانے آ گیا۔ میں نے کچھ دوسرے ضروری کام نمنائے تھے، ان میں مصروف ہو گیا۔ شام سات بجے کے قریب وہ ہینڈ کانشیل آ گیا جو پوٹارم کے لیے مقتول جو ہر علی کی لاش کے ساتھ گیا تھا۔ وہ پوٹارم رپورٹ لے آیا تھا۔ مقتول لاش کو ضروری کارروائی کے بعد اس کے بیٹے مظہر علی کے سپرد کر دیا گیا۔

میں نے پوٹارم رپورٹ دیکھی۔ موت کا وقت رات بارہ بجے کے ذرا بعد کا لکھا تھا۔ مقتول کے معدے میں غیر ہضم شدہ غذا موجود تھی۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مقتول کے جسم پر چا تو یا خنجر کے پانچ زخم تھے۔ پوٹارم رپورٹ میں ان کی لمبائی اور گہرائی بھی لکھی تھی۔ ایک زخم نے معدے اور انتڑیوں کو کاٹ دیا تھا۔ باقی



ISO 9001 - 2008

Tamoor  
FANS

120950

رجسٹرڈ  
تیمور فین

تیمور فین کی دیگر مصنوعات

برقی مدھانی، واشنگ مشین، ایر کولر،  
گیس ہیٹر، کولنگ ریج، واٹر ہیٹر175342  
رجسٹرڈ  
جمال

تیمور فین کمپنی

32B سال انڈسٹریز اسٹیٹ سہجرات

053-3524181, 3511167

قتل نہیں کیا۔

”تم نے غیرت میں آکر قتل کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اقبال جرم کر لو، میں تمہاری مدد کروں گا اور کیس ایسا بناؤں گا کہ فوری اشتعال ثابت ہو جائے۔ تمہیں بہت تھوڑی سزا ہوگی۔“

وہ اپنے گوروؤں کی قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا۔ مجھے اس کی قسموں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ پولیس والے قسموں کی بجائے حالات و واقعات اور شواہد کو سامنے رکھتے ہیں۔ حالات و واقعات بھوپندر کے خلاف تھے۔ قتل کی بڑی صاف وجہ موجود تھی۔

میں نے بڑے استاد کی طریقوں سے اسے منوانے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ یہ قتل اس نے نہیں کیا۔ ایک ہی سوال کو میں نے تھما پھرا کر کئی بار پوچھا۔ میں نے اس کی یہ حالت کر دی تھی کہ وہ رونے پر آ گیا لیکن اس کے باوجود اس کے منہ سے کچھ نہ اگلا۔ میرا اپنا دماغ چکرانے لگا تھا۔ اب مجھے اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ میں نے اپنے اے ایس آئی کو بلا کر کہا کہ صبح تک اس سے اقبال جان چاہتا ہوں میری طرف سے اجازت ہے، بے شک اسے ذبح کر دو۔ اے ایس آئی اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اپنی کئی کہانیاں میں بتایا ہے کہ تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن کبھی کبھار جب کبھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلتا تو انگلیاں مجبوراً میز می کر لیتا تھا۔ اس سکھ کے بچے نے میری کھوپڑی چلپی کر کے رکھ دی تھی۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اس سارے ڈرامے کے ایک اہم کردار کو میں نظر انداز کر گیا ہوں۔ یہ اہم کردار تھا، بھوپندر سنگھ کی بیوی رینی کور۔ میں نے ایک کانٹنیل کو بلا کر کہا کہ وہ صبح میرے آنے سے پہلے رینی کو روک کر تھانے میں بٹھا رکھے۔ اس کے بعد میں آرام کرنے کے

لیے تھانے سے نکل آیا۔  
جب میں تھانے سے نکل رہا تھا تو مجھے بھوپندر سنگھ کی چی و پکار سنائی دے رہی تھی۔  
سنگھ نے مشکل میں ڈال دیا

اگلے دن میں معمول سے ذرا جلد تھانے آ گیا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی تھی کہ میں نے ابھی تک رینٹی کور کا بیان نہیں لیا تھا۔ تھانے آ کر مجھے پتہ چلا کہ رینٹی کور آپکی ہے اور دوسرے کمرے میں بٹھایا ہوا ہے۔ میں نے اس کو بلانے سے پہلے اسے ایس آئی کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ بھوپندر سنگھ نے اقبالی بیان دینے پر آمادگی ظاہر کی ہے یا نہیں۔

”وہ انسان نہیں جانور ہے“۔ اے ایس آئی نے کہا۔ ”اتنا زیادہ تشدد کوئی ملزم برداشت نہیں کرتا اور تا کر وہ جرم کا اقبال بھی کر لیتا ہے مگر اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ بس یہی کہتا ہے کہ مجھے بے شک جان سے مار ڈالو، جو کام میں سے نہیں کیا اسے کیسے مان جاؤں۔“  
اے ایس آئی کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ ہمیں ایسا تو نہیں کہہ بھوپندر ٹھیک کہہ رہا تھا یہ قتل کسی اور نے کیا ہو اور کون جو ہر علی کو قتل کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب حاصا مشکل تھا۔ میں نے اے ایس آئی سے کہا کہ وہ رینٹی کور کو میرے پاس بھجوادے، بھوپندر کے متعلق بعد میں بات کروں گا۔

تھوڑی دیر بعد ایک کانسٹیبل رینٹی کور کو گولے کر آ گیا۔ وہ صبح معنوں میں پنجاب کی مٹی کا شاہکار تھی۔ مردوں کی طرح اونچا لمبا قد، انتہائی مناسب بدن۔ اس کا رنگ گورا نہیں تھا بلکہ گندمی تھا اور نیم نقش میں جاؤ بیت تھی۔ میں اس کا تاک نقشہ پولیس والوں کی زبان میں پیش کر رہا ہوں۔ تھانیدار کی بجائے میں اگر شاعر ہوتا تو ایک غزل میں اس کا نقشہ کھینچتا اور مبالغے کی حد تک چلا جاتا۔

اس کا تاک نقشہ بتانے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ اس قابل تھی کہ مرد اس کی خاطر کسی دوسرے مرد کو قتل کر دے یا خود قتل ہو جائے۔ وہ گھبرائی ہو بالکل نہیں تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بڑی بڑا اعتماد عورت ہے۔ میں نے اسے بیٹھے کو کہا تو وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اس کا اور بھوپندر کا جھگڑا کیوں ہوا تھا؟

”وہ پکار رہے غیرت ہے جی!“۔ اس نے غصے سے کہا۔ ”میں اس کے گھر کی عزت تھی اور وہ بے شرم مجھے لوٹ کا مال سمجھ کر جوئے میں ہار آیا تھا۔“

اس کے بعد رینٹی نے سارا واقعہ تفصیل سے سنا دیا۔ میں درمیان میں اس سے جہاں ضرورت پڑی سوال بھی پوچھتا گیا۔ اس نے اس بات کا اقرار بھی کر لیا کہ اس کے مقتول جو ہر علی کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔

”آپ خود انصاف کریں۔“۔ رینٹی کور نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”جوئے میں ہاری ہوئی چیز جیتنے والے کی ہوتی ہے۔ جو ہر علی نے مجھے جیت لیا تھا۔ اصولاً میں اس کی ملکیت ہو گئی تھی۔ میں اپنے بے غیرت خاوند کو سبق سکھانے کے لیے جو ہر علی کے پاس چلی گئی۔“

”بھوپندر کار د عمل کیا تھا؟“۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا اس نے تمہیں اور جو ہر علی کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی تھیں؟“

”ہاں، کئی بار دی تھیں۔“۔ رینٹی نے کہا۔ ”مگر وہ جو ہر علی سے کچھ خائف سا تھا۔“

”کیا مقتول جو ہر علی قتل والی رات تم سے ملا تھا؟“۔ میں نے پوچھا۔

”نہیں!“۔ رینٹی کور نے کہا۔ ”پچھلے تین چار دنوں سے میری اس کے ساتھ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں کچھ پریشان تھا۔ منڈی میں اس کا

نے کہا۔ ”یہ میرا اپنا خیال ہے، ویسے انسان کرنے پر آئے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ قتل کرنے کے لیے غیرت مند ہونا اور غصہ آنا ضروری ہے۔ بھوپندر اگر غیرت اور غصے میں قتل کرتا تو ڈیڑھ دو ماہ انتظار نہ کرتا، فوراً قتل کر دیتا۔۔۔۔۔ وہ پکا بے غیرت ہے اور کھوکھلی دھمکیاں دیتا پھرتا تھا۔“

رینی کی بات میں وزن تھا اور یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ بھوپندر کو بچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے تو ہر ایک کو شک کی نگاہ سے ہی دیکھنا تھا۔

بہر حال میں نے رینی سے کچھ مزید باتیں پوچھیں اور اس کا بیان قلمبند کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اسے یہ کہہ کر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ مجھے بتائے بغیر گاؤں سے باہر نہ جائے اور جب بھی اس کی ضرورت پڑے، تمھانے حاضر ہو جائے۔

مخالفوں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اسے اپنا کام چلانے کے لیے جیسوں کی ضرورت تھی۔“

رینی کا جواب سن کر مجھے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے مقتول جو ہر علی کا منڈی میں جھگڑا ایسی نوعیت اختیار کر گیا ہو کہ مخالفوں نے اس کا کام تمام کر دیا ہو۔ میں نے اس پہلو پر بھی اپنی تفتیش کو لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب میرے پاس دو مشتبہ ہو گئے تھے۔ بھوپندر سنگھ میرا مشتبہ نمبر ایک تھا اور مقتول جو ہر علی کے کاروباری حریف دوسرے نمبر پر تھے۔

میں نے تفتیش کے دائرے کو مزید وسیع کرتے ہوئے منڈی تک بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے رینی سے پوچھا۔ ”جو ہر علی کو بھوپندر نے قتل کیا ہے؟ کیا اس میں اتنی ہمت ہے کہ قتل کر سکے؟“

”بھوپندر میں اتنی ہمت نہیں ہے۔“ رینی کو

ISO 9001:2008

النور فین

رجسٹرڈ

النور الیکٹرک انڈسٹریز 75۔ بی، شمال انڈسٹریز اسٹیٹ، جی ٹی روڈ گجرات

053-3530447 , 0300-9702203 , 0345-6333393

<http://www.alnoorfans.com>



اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”آپ کو میرا اقبالی بیان چاہئے نا؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔

”مجھے صرف آدمے سمجھنے کی چھٹی دو صاحب جی!“ اس نے کہا۔ ”واپس آکر اقبالی بیان بھی دوں گا اور اگر قتل بھی پیش کروں گا۔“

”پہلے اقبالی بیان دو“ میں نے کہا۔ ”اگر قتل برآمد کرنا پھر کوئی بات کرنا۔“

”آپ پہلے اقبالی بیان چاہتے تو نکھیں۔“ بھوپندر نے کہا۔ ”میں نے اپنی بیوی رینی کو روک بد چلتی اور بد معاشریوں کی وجہ سے کرپان سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے پوچھا۔ ”میں مقتول جو ہر علی کا قتل کی بات کر رہا ہوں اور تم بات کو کدھر لے جا رہے ہو۔“

”جو ہر علی کا قتل میں نے نہیں کیا۔“ اس نے بڑے پختہ لہجے میں کہا۔ ”یہ بات آپ لکھ لیں۔ رینی میرے ہاتھوں قتل ہو گئی۔ مجھے صرف آدمے سمجھنے کے لیے چھوڑ دیں، میں اس حرامزادی کا کام کر کے پیش ہو جاؤں گا۔“

میں نے اس سے پہلے بھی کئی تفتیشی کہانیوں میں سکھوں کے متعلق لکھا ہے۔ یہ بڑے جذباتی ہوتے ہیں اور قتل کر کے بڑے فخر سے قاتل نے پیش ہو جاتے تھے۔ ان کے ساتھ زیادہ مغز نہیں کھپانا پڑتا تھا مگر اس سکھ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اب تو مجھے بھی شک ہونے لگا تھا کہ جو ہر علی کو اس نے قتل نہیں کیا۔ میں نے اس کے ساتھ بڑا مغز کھپایا تھا لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ میں نے اسے واپس حوالات میں بھجوا دیا اور خود دوسرے پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ واردات کو دودھلا

رہی ابھی میرے پاس ہی بیٹھی تھی کہ میں نے اسے ایس آئی کو بلا کر اس کے کان میں کہا کہ وہ بھوپندر سنگھ کو اس طرح لے آئے کہ وہ رینی کو دیکھ لے۔ وہ چلا گیا تھا۔

ادھر رینی میرے کمرے سے نکلی، ادھر سے اسے ایس آئی بھوپندر کو لے کر آ رہا تھا۔ دونوں کا آتنا سامنا ہوا تو بھوپندر نے اسے سکھوں والی ایک بڑی ہی تنگی گالی دی۔ اس کے جواب میں رینی نے بھی اسے تنگی گالیاں دینی شروع کر دیں اور اسے بے غیرت، نامرد اور عورتوں کا دلال جیسے خطاب دینے شروع کر دیئے۔

بھوپندر سنگھ نے رینی پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر اسے ایس آئی اسے کھینچ کر پیسے پاس لے آیا اور رینی کبھی جھپکتی تھانے سے نکل گئی۔ غصے کے مارے بھوپندر کا برا حال تھا۔ اس کا منہ سے کف اڑ رہا تھا اور وہ رینی کو گالیاں بک رہا تھا۔ میں نے اسے خاموش ہونے کو کہا تو وہ چپ ہوا۔

میں نے اس کے غصے سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور اسے کہا کہ اس کی بیوی یہ بیان دے کر گئی ہے کہ قتل والی رات اس نے مقتول جو ہر علی کو اپنے خاندان کے ساتھ کھیتوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

”بکواس کرتی ہے حرامزادی۔“ بھوپندر سنگھ نے کہا۔ ”وہ مجھے پھائے (پھاسی) لگوانا چاہتی ہے۔“

”میں تمہیں پھانسی نہیں لگنے دوں گا۔“ میں نے کرسی سے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”یہ مردوں والا وعدہ ہے۔ تم اقبالی بیان دے دو، پھر اس کیس سے تمہیں نکالنا میرا کام ہے۔“

اس نے ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا جن میں بے انتہاری صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچنے لگا جیسا کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ پھر

دن تھا اور میں ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔ میں نے اگلے دن کالانچل مل بنایا کہ اب نقش کش کو کس رخ پر لے کر جانا ہے۔ مجھے بھوپندر سنگھ کے علاوہ بھی کچھ امکانات پر غور کرنا تھا۔

میں اگلے دن کا پروگرام بنا کر تھانے سے آ گیا۔

رام کی دیتا

اگلے دن کیا ہونے والا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ میں بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں سو رہا تھا جب میرے سرکاری کوارٹر کا دروازہ کھٹکٹایا جانے لگا۔ دستک کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے قریبی میز پر پڑی کلائی گھڑی اٹھا کر دیکھی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ اس وقت لگتا جیسا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تھانے سے کوئی آیا ہوگا۔ ضرور کوئی ایسی واردات کی اطلاع آئی ہوگی جس کے لیے میری موجودگی ضروری تھی۔ چھوٹی موٹی واردات کے لیے مجھے کوئی جگانے نہیں آ سکتا تھا۔

میں نے دروازے پر جا کر دیکھا، میری توقع کے عین مطابق ایک کانشیل گھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے۔

”قتل کی واردات آئی ہے جناب!“۔ کانشیل نے سردی سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ ”نمبر دار تلجارام کا پنا نقل ہو گیا ہے۔“

”واردات کی اطلاع لے کر کون آیا ہے؟“۔ میں نے پوچھا۔

”نمبر دار تلجارام خود آیا ہے جناب!“۔۔۔ کانشیل نے کہا۔

میں نے کانشیل سے مزید کچھ پوچھ کر وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور جلدی جلدی وردی پہن کر اس کے ساتھ تھانے کی طرف چل پڑا۔ تھانے پہنچا تو وہاں تلجارام روٹی صورت بنائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ

گھڑا ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر چھکی دے کر اسے حوصلہ دیا۔

”بڑا قلم ہوا ہے سرکار!“۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میرا ایک ہی بیٹا تھا۔“

تلجارام کے منہ سے ٹھیک طرح بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دلاسا دیا تو وہ کچھ سنبھل گیا۔ اس کے بیٹے کا نام دیارام تھا اور یہی ایک بیٹا اس کی کل اولاد تھا۔ اسے تو پچھڑیں مار مار کر رونا چاہئے تھا مگر وہ بڑے حوصلے میں تھا۔ میں اس کا حوصلہ اور ضبط دیکھ کر حیران رہ گیا۔

میں نے تلجارام کی حالت پر غور کیا تو بڑا حیران ہوا۔ اس کے سفید کپڑے خون آلود تھے۔ خون کے بڑے بڑے دھبے اور چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ کرتے کا ایک ٹکڑا بھی ٹوٹا ہوا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے آنسو بھری آواز میں بتایا کہ اس کے بیٹے نے اس کی گود میں دم توڑا تھا۔ کپڑوں پر اس کا خون لگ گیا تھا۔

یہ تفصیل میں آگے چل کر تلجارام کے بیان میں پیش کروں گا۔

میں نے ایف آئی آر درج کی اور تلجارام کا بیان لینے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے راستے میں اس سے پوچھ کچھ کرنا گیا۔ ہم گاؤں پہنچے تو تلجارام کی حویلی کے باہر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ دیہات کے لوگ صبح سویرے اٹھ کر اپنے دن کا آغاز کر دیتے ہیں اور شام ڈھلتے ہی اپنے گھروں میں گھس جاتے ہیں۔

تلجارام کی حویلی پکی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی اور دو منزل تھی۔ اوپر کی منزل پر صرف دو کمرے تھے جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ پیردنی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو آگے کا محن تھا جس پر گائے کے گوبر سے لپٹائی کی گئی تھی۔ محن میں ایک طرف ایک گائے بندھی نظر

سال بتائی تھی۔ میں مقتول دیارام کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اتنا صحت مند تھا کہ پندرہ سولہ سال کی بجائے بیس بائیس سال کا لگتا تھا۔ میری حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ دیارام مقتول کا قد کسی طرح بھی چھ فٹ سے کم نہ ہوگا۔ مرنے کے باوجود اس کا کورنگ مانند نہیں پڑا تھا۔ اس کے برعکس تجارام اور اس کی بیوی گندمی سے رنگ کے مالک تھے اور قد کا ٹھ بھی درمیانہ تھا۔ بعض عام سی شکل کے ماں باپ کی اولاد بہت خوبصورت ہوتی ہے، یہ بات کئی بار مشاہدے میں آچکی ہے۔

میں جوں جوں مقتول کے چہرے کی طرف دیکھا رہا تھا، مجھے کوئی خاص بات محسوس ہو رہی تھی مگر کوشش کے باوجود جو میرا احساس الفاظ میں نہ ڈھل سکا اور میں سمجھ نہ سکا کہ میرا ذہن کیا سمجھانا چاہ رہا ہے۔ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو میرے ذہن میں چھ رہی تھی لیکن اس وقت میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

فرش پر کرتے کا ایک ٹخن پڑا ہوا تھا۔ ٹخن میں نے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ یہ قاتل کا ہمدھم ہو سکتا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ تجارام کے کرتے کا ٹخن بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ جس وقت وہ اپنے دم توڑتے بیٹے کو سنبھال رہا تھا، ہو سکتا تھا یہ ٹخن اس وقت ٹوٹا ہو۔

میں نے بڑی باریک بینی سے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر مقتول کے کپڑوں کی تلاشی لی اور نچلے اٹھا کر دیکھا کہ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جو تحقیق میں مدد دے لیکن کوئی ایسی چیز میرے ہاتھ نہ لگی۔ میں نے موقع پر جو کارروائی کرنی تھی، وہ کی اور لاش کو پوشاڑم کے لیے بچھوانے کا بندوبست کیا۔ لاش پوشاڑم کے لیے چلی گئی تو میں تجارام کے پاس آ بیٹھا۔ اس کا جوان بیٹا مل ہو گیا تھا۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

میں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی اور وہ

آ رہی تھی۔ ہندو گائے کو مقدس اور اس کے گوبر پیشاب کو پوتر (پاک) سمجھتے ہیں، اس لیے خاص طور پر گائے کے گوبر اور پیشاب سے اپنے باورچی خانے اور گھر کی لپیائی کرتے ہیں۔ یوں تو تلجھارام کے پاس بے شمار مویشی ہوں گے جو اس نے باہر کہیں باڑے وغیرہ میں رکھے ہوں گے۔ گھر میں یہ گائے برکت کے لیے رکھی ہو گی۔ یہ ان کی مانتا بھی تھی۔

صحیح کے سامنے کی طرف جہاں صحن ختم ہوتا تھا، وہاں ایک برآمدہ تھا اور برآمدے کے بعد چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ بائیں طرف ایک اناج ذخیرہ کرنے کے لیے سنور نما زکمرہ بنا ہوا تھا اور صحن کے دائیں طرف سے ایک سیڑھی اوپر والی منزل کی طرف جاتی تھی۔

تجارام نے بتایا کہ اس کا بیٹا اوپر والے کمرے میں سوتا تھا۔ اسے اوپر لگ تھلگ رہنا پسند تھا۔ وہ اوپر والے کمرے میں ہی نکل ہوا تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھا کر اوپر چلا گیا۔ دائیں طرف والا کمرہ دیارام کا بیڈروم تھا اور بائیں طرف والے کمرے میں دیارام کا سامان وغیرہ پڑا تھا۔

میں بیڈروم میں داخل ہوا تو ایک شاہانہ قسم کے بیڈ پر دیارام پشت کے مل پڑا تھا۔ چہرے پر اذیت کے آثار تھے اور آنکھیں مٹی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایسی حیرانگی تھی جیسے پوچھ رہی ہوں کہ یہ کیا ہو گیا۔

بستر کی چادر پر خون ہی خون جما ہوا تھا۔ ارد گرد بھی خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ لاش کے دونوں ہاتھوں نے اپنا سینہ پکڑ رکھا تھا۔ سینے پر دل کے مقام والی جگہ سے کئی دونوں مٹھیوں میں بکڑا ہوا تھا۔ سینے پر ایک گہرا اثر تھا جس سے خون بہہ بہہ کر جم گیا تھا۔ آگے نکل دہاں موجود نہیں تھا۔ اسے غالباً لمبے پھل والے چاقو سے قتل کیا گیا تھا۔

تجارام نے اپنے بیٹے دیارام کی عمر پندرہ سولہ



قل کی واردات کے بارے میں تلجھارام نے بتایا کہ اسے پیشاب کی بیماری ہے۔ وہ رات کو دو تین مرتبہ پیشاب کے لیے اٹھتا ہے۔ قل والی رات بھی وہ سویا ہوا تھا کہ اسے بڑے زور کی پیشاب کی حاجت ہوئی۔ اس نے سونے کی کوشش کی لیکن جب تک وہ پیشاب نہیں کر لیتا تھا اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اگر وہ زبردستی پیشاب روکنے کی کوشش کرتا بستر پر ہی اس کا پیشاب نکل جاتا تھا۔

وہ پیشاب کر کے اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا کہ اچانک اسے اوپر بیٹے کے کمرے سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرا گیا اور بیٹے کے کمرے کی طرف بھاگا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا، تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر سکتے ہیں رہ گیا۔ دیوارام نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ بکڑا ہوا تھا اور اس کے کپڑے خون سے لٹ پٹ ہو رہے تھے۔ وہ بڑی تکلیف میں تھا اور کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔

تلجھارام نے تڑپ کر بیٹے کو سنبالا اور اس سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔

”اوه..... باپو..... میں گیا.....“۔ دیوارام نے اتنا ہی کہا اور پھر اس نے تلجھارام کے ہاتھوں میں ہی دم توڑ دیا۔

بیٹے کی لاش دیکھ کر تلجھارام کی دھڑکن مٹی۔ اس کی بیوی کا نتایہ آواز سن کر اوپر دوڑی آئی۔ جب اس نے اکلوتے بیٹے کو لاش کی صورت میں دیکھا تو خوف اور صدمے سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ سکتے میں آگئی۔ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولی۔

تلجھارام نے بتایا کہ کا نٹا ابھی تک اسی کیفیت میں ہے۔ گاؤں کی عورتوں نے اسے رلانے کی بہت کوشش کی ہے لیکن اس کا سکہ نہیں ٹوٹ رہا۔

میری باتوں کے جواب دینے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی اپنی یا اس کے بیٹے کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی تھی۔

”میں نے کبھی کسی کو دشمن نہیں بنایا۔“ تلجھارام نے کہا۔ ”ہر کسی کے ساتھ پیار محبت کیا ہے۔ ہر کسی کو دوست بتایا ہے..... یہی حال دیوارام کا تھا۔ وہ تو بڑا ہی معصوم تھا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

یہ ایک باپ کی سوچ تھی کہ اس کا جوان بیٹا بڑا معصوم تھا۔ میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ جوانی کی عمر ہو، خوشحالی ہو اور بیٹا لاڈ والا بھی ہو تو پھر بچکنے کے امکانات سو فیصد ہوتے ہیں۔ میں نے ایسی معلومات گاؤں والوں سے اور مقتول دیوارام کے بے تکلف دوستوں سے لینی تھیں۔

میں خاصی دیر تک تلجھارام سے پوچھ چمکھ کرتا رہا۔ اس سے مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہو میں آپ کو ایک ترچیب سے سنا دیتا ہوں۔

تلجھارام کی شادی کا نٹا دیوی سے ہوئی تھی۔ شادی کو تین چار سال گزر گئے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ انہوں نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ کسی نے جو علاج بتایا وہ کیا۔ دیکھو ٹوٹے ٹوٹے، ولاہی دوائیاں کھائیں مگر لا حاصل۔ جب تھک مار کر بیٹھ گئے تو شادی کے چھپنے سال کا نٹا کی گود ہری ہوئی اور بیٹا پیدا ہوا۔ چونکہ یہ بیٹا بڑی منتوں مرادوں اور دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا، اس لیے تلجھارام کی بیوی کا نٹا نے ہندو عقیدے کے مطابق اس کا نام دیوارام رکھ دیا یعنی رام کی مہربانی۔

انہوں نے بڑے لاڈ پیار سے اس کی پرورش کی۔ بیٹے کی خوشی میں سارے گاؤں میں خوشیاں منائی گئی تھیں۔ گاؤں کے لوگ تلجھارام کو بہت پسند کرتے تھے۔ دیوارام بڑا خوب صورت جوان نکلا۔ وہ چھوٹی عمر سے ہی بڑا تھکدار اور سلجھاوا تھا۔

## فرمانِ رسولؐ

آدمی کا ثواب کی نیت سے اپنے اہل خانہ پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔ (بخاری شریف۔ 4006)

”دیکھو، تمہارا اجیری یا رسل ہو گیا ہے“۔ میں نے تینوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”کوئی کسی کو پونجی جان سے نہیں مارتا۔ اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے اور میں وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ ان وجوہات میں عام طور پر کسی لڑکی کے ساتھ دوستی، کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا یا دشمنی یا جائیداد وغیرہ کا چکر ہوتا ہے۔ وہ اگلتا بیٹا تھا، اس لیے جائیداد کے جھگڑے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔۔۔۔۔ اب تم بتاؤ کہ مقتول کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر ہو گا یا کسی کے ساتھ دشمنی ہوگی؟“

میری بات سن کر تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کر لیا کہ تینوں میں کون بولے گا۔

”دیارام کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔“

”تینوں میں سے ایک لڑکے نے کہا۔“ ”نہ ہی اس کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی ایسا ویسا چکر تھا۔ وہ تو بہت ہی سیدھا سادہ مگر حساس لڑکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل سے لگا لیتا تھا اور کڑھتا رہتا تھا۔ پہلے وہ بالکل ٹھیک رہتا تھا۔ لیکن پچھلے دس بارہ دنوں سے اس میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔“

”کیسی تبدیلی آئی تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ بہت چڑچڑا ہوا گیا تھا۔“ اسی لڑکے نے

کہا۔ ”ہر وقت مایوسی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ یہی کہتا تھا کہ اس کا وجود بیکار ہے۔ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرنے لگا تھا کہ لوگ اس سے نفرت کریں یا اسے ماریں۔ دو مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ کہیں سے دھکی شراب پی کر

طوائف اور شریف خون

تلخا رام سے بیان لینے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اچھی طرح یاد کر کے بتائے کہ جب وہ تھانے رپورٹ لکھوانے کے لیے آیا تھا تو اس کی حویلی کا بھرونی دروازہ اندر سے بند تھا یا کھلا ہوا تھا۔ اس کے جواب میں اس نے بتایا کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ قاتل یا تو مقتول کا کوئی دوست تھا جسے مقتول خود دروازہ کھول کر اندر لے آیا تھا یا پھر قاتل دیوار پھانڈ کر محن میں کودا ہو گا اور اپنا کام کر کے اطمینان سے دروازہ کھول کر فرار ہو گیا۔ میں نے محن میں قاتل کے کھرے دیکھنے کی بہت کوشش کی لیکن وہاں گوگرد کی لپٹائی کی وجہ سے کسی قسم کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے محن کے اندر دیوار کے ساتھ ساتھ محوم کر ساری دیوار اور زمین کو دیکھا لیکن مجھے کہیں کوئی رگڑ یا نشان نظر نہ آیا۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں حویلی کی بیضک میں بیٹھ گیا اور تلخا رام سے مقتول دیارام کے خاص خاص دوستوں کے نام پوچھے۔ اس نے تین لڑکوں کے نام بتائے جن کے ساتھ اس کی بے تکلفی والی دوستی تھی۔ میں نے گاؤں کے ہی ایک آدمی کو بھیجا کہ ان تینوں لڑکوں کو یہاں لے آئے۔ آدمی گیا اور زچہ منٹ بعد ہی تینوں لڑکوں کو ساتھ لے آیا۔ اس نے بتایا کہ سارے گاؤں والوں کو دیارام کے قتل کا ظلم ہو چکا ہے اور لوگ حویلی کے باہر جمع ہیں۔ یہ لڑکے بھی لوگوں کے ساتھ باہر کھڑے تھے۔ دیارام ان کا گھر دوست تھا۔ تینوں لڑکے اداس ٹھکیں نظر آ رہے تھے۔

میں نے تینوں کو بٹھالیا اور ان سے کہا کہ کسی ظالم نے ان کے دوست کو قتل کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے دوست کے قاتل کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دوں۔ اس کے لیے مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔

لڑکے چلے گئے تو میں نے اسے پھر بٹھالیا۔  
 ”ایسی کون سی بات ہے؟“۔ میں نے اس  
 لڑکے سے پوچھا۔ ”جو تم دوسروں کے سامنے نہیں  
 بتانا چاہتے تھے؟“

اس نے پہلے تو اس بات پر حیرانی کا اظہار کیا کہ  
 میں اس کے خفیہ سے اشارے سے یہ بات سمجھ گیا  
 ہوں کہ وہ علیحدگی میں کوئی بات بتانا چاہتا ہے۔ پھر اس  
 نے بتایا کہ اس کا نام سیف اللہ ہے اور دیارام سب سے  
 زیادہ اس کے ساتھ بے تکلف تھا۔

”یہ بات دیارام نے صرف مجھے بتائی  
 تھی۔“ سیف نے کہا۔ ”اگرچہ وہ مرچکا ہے لیکن  
 میں اس کے مرنے کے بعد بھی یہ بات دوسروں کے علم  
 میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ آپ کو بھی صرف اس لیے بتا رہا  
 ہوں کہ شاید اس سے قاتل کو پکڑنے کے لیے کوئی سراغ  
 مل جائے۔“ بات یہ ہے کہ پچھلے دو تین ماہ کے عرصے  
 میں دیارام بڑی باقاعدگی سے ہفتے میں ایک دو بارہ شہر  
 جانے لگا تھا۔ ہم سب دوست اس سے پوچھتے تھے کہ وہ  
 شہر کیا کرنے جاتا ہے تو جواب میں وہ نا مل جاتا تھا۔

”پھر ایک دن خود ہی اس نے میرے آگے شہر  
 جانے کا راز کھول دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ شہر میں ایک  
 طوائف کے گھر پر جاتا ہے اور اسے وہ طوائف بہت  
 اچھی لگتی ہے۔ اس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ باپ کے  
 پیسے چوری کر کر کے اس طوائف کو دیتا رہتا ہے اور  
 طوائف بھی اس سے بہت پیار کرتی ہے۔“

”اس نے طوائف کا نام نہیں بتایا تھا؟“ میں  
 نے سیف سے پوچھا۔  
 ”کوئل کماری!“ سیف نے کہا۔ ”دیوارام  
 اکثر کہتا تھا کہ وہ اپنے نام کی طرح کوئل ہے۔“  
 ”اور کوئی خاص بات؟“ میں نے اسے ٹھٹھا۔  
 ”ہاں، یاد آیا۔“ سیف نے چونک کر کہا۔

ہمارے پاس آگیا اور اپنی سیدھی حرکتیں کرنے لگا۔ وہ  
 ایسی بری حالت میں تھا کہ دیکھ کر دل کو دکھ ہوتا تھا کہ  
 اتنے شریف والدین کا بیٹا ایسی حرکتیں کر رہا ہے۔  
 ”ایک مرتبہ تو اس نے جدیدی کر دی۔ لگاؤں کے  
 موچی کی جوان بیٹی گزر رہی تھی۔ دیارام نے اس کا  
 راستہ روک لیا اور اس سے اپنی سیدھی بکواس کرنے لگا۔  
 لڑکی گھبرا گئی مگر اس نے کچھ نہ کہا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ  
 یہ نمبر دار کا بیٹا ہے۔ چند اور لوگوں نے بھی یہ منظر دیکھا  
 مگر دیارام کو کچھ بھی نہ کہا بس پیار سے سبھا دیا۔ میں  
 نے دیارام سے کہا کہ وہ ایک کی کمین کی لڑکی سے کیوں  
 مت لگا رہا تھا اگر ایسا کام کرتا ہی ہے تو اپنے برابر کے  
 خاندان کی لڑکی دیکھو۔“

”سب سے بڑا کمینہ میں خود ہوں۔“ دیارام  
 نے جواب میں کہا۔ ”میں بچ اور گھنپا ہوں۔“  
 ”ایسی حرکتیں تو ناکام عاشق کیا کرتے  
 ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ضرورتہا رے دوست کو کسی  
 لڑکی نے ٹھکرادیا ہوگا۔“

”اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ہم سے چھپی نہ  
 رہتی۔“ دیارام کے دوسرے دوست نے کہا۔  
 ”خاص طور پر مجھ سے وہ کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔“  
 اس لڑکے نے بات ختم کر کے میری آنکھوں میں آنکھیں  
 ڈالیں اور ایک اشارہ کیا۔

میں اس کے اشارے کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ کوئی  
 ایسی بات بتانا چاہتا تھا جو دوسرے لڑکوں کے سامنے  
 بتانے والی نہیں تھی۔ میں نے لڑکوں سے چند اور باتیں  
 ادھر ادھر کی پوچھ کر ان کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی  
 اجازت دے دی۔ جب وہ اٹھ کر باہر نکلے لگے تو میں  
 نے اس لڑکے کو آواز دے کر روک لیا جس نے مجھے آنکھ  
 سے اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس سے  
 کچھ کام ہے، وہ ذرا دیر اور بیٹھ جائے۔ باقی دونوں



تھا۔“

”دیارام اپنے پاس ایک چاقو رکھتا تھا۔“ میں نے تلجیارام سے پوچھا۔ ”وہ چاقو اب کہاں ہے؟“ تلجیارام ایک دم پریشان سا نظر آنے لگا مگر پھر فوراً ہی سنبھل گیا اور بولا۔ ”چاقو والی بات میرے عمل میں نہیں ہے سرکار!“ اس نے ذرا توقف کیا اور پھر کہنے لگا۔ ”وہ تو بہت ہی سیدھا اور معصوم سا بچہ تھا، اس نے چاقو کو کیا کرتا تھا؟“

”ہر باپ اپنی اولاد کو سیدھا اور معصوم ہی سمجھتا ہے۔“ میں نے تلجیارام سے کہا۔ ”نکیا یہ بات تمہارے علم ہے کہ تمہارا سیدھا اور معصوم بچہ اسی عمر میں ایک طوائف کے گونچے پر جاتا تھا؟“

میری یہ بات سن کر تلجیارام کی حالت بری ہو گئی۔ سردی میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ مجھے احساس تھا کہ اپنے مردہ بنے کے بارے میں یہ انکشاف سن کر وہ کسی کرب سے زگر رہا ہوگا۔ وہ نہایت شریف اور نیک نام آدمی تھا اور اب اس کی برسوں کی کمائی ہوئی عزت خطرے میں پڑ گئی تھی۔

”میں یہ بات جانتا تھا۔“ تلجیارام نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا۔

”تم نے یہ بات مجھ سے کیوں چھپائی؟“ میں نے غصے سے پوچھا۔

”آپ میری مجبوری سمجھتے ہی سرکار!“

تلجیارام نے کہا۔ ”کہ میں اس بات کو کیوں چھپا گیا۔ وہ گھر سے پیسے چوری کر کے طوائف کے پاس جاتا تھا۔“

”تم نے اسے روکا نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی تھی۔“

تلجیارام نے کہا۔ ”اس کے آگے ہاتھ تک جوڑے تھے لیکن وہ نہیں مانتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اسے

”آخری دنوں میں دیارام اپنے پاس ایک خوفناک چاقو رکھنے لگا تھا۔ یہ کھٹکے والا چاقو تھا۔ کھٹکا دبانے سے چھانچ کا پھل ایک جھکے سے نکل آتا تھا۔ میں نے بار بار یہ چاقو اس کے پاس دیکھا تھا اور اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ چاقو کیوں لیے بھرتا ہے، کیا کسی کے ساتھ دشمنی ہو گئی ہے؟“ اس کا جواب یہ تھا کہ اس چاقو سے وہ ایک پانی کو قتل کرنا چاہتا ہے، جب بھی داؤ لگ گیا وہ یہ چاقو اس پانی کے دل میں اتار دے گا۔“

لیکن ہوا اس کے برعکس تھا۔ لگتا تھا وہی پانی اپنا چاقو اس کے دل میں اتار گیا تھا۔ دیارام کا دشمن اس سے تیز ثابت ہوا تھا۔

”اس نے تمہیں اپنے دشمن کا نام نہیں بتایا تھا؟“

میں نے سیف سے پوچھا۔

”نہیں!“ سیف نے مایوسی سے کہا۔ ”میں

نے پوچھنے کی کوشش کی تھی اور اس کا ساتھ دینے کا وعدہ

بھی کیا تھا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا

تھا، سیف! یہ میری زندگی کا ایسا راز ہے جو میں تمہیں بھی

نہیں بتا سکتا۔ کسی کو نہیں بتا سکتا۔ یہ میری آگ ہے

اور اس میں صرف میں ہی جلوں گا۔“

میں نے سیف سے کرید کیرو کر اور بھی باتیں

پوچھیں۔ وہ میرے سوالوں کا جواب دیتا رہا اور مجھے اس

سے بڑے کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان باتوں کی

روشنی میں اس نے اپنی تفتیش کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کر

لیا۔ میں نے سیف کا شکریہ ادا کیا اور اسے جانے کی

اجازت دے دی۔

سیف چلا گیا تو میں نے نمبردار تلجیارام کو بلا لیا اور

اس سے پوچھا کہ آخری دنوں میں دیارام کچھ پریشان

سا رہتا تھا، کیا یہ بات صحیح ہے؟

”ایسی ہی بات تھی۔“ تلجیارام نے کہا۔

”میں نے کئی بار پوچھا بھی تھا لیکن وہ کچھ بتاتا نہیں

تھا۔ یہی غم موت کا باعث بنا تھا۔ موت کا وقت رات اڑھائی اور تین بجے کے لگ بھگ لکھا گیا تھا۔

میں نے اس دن کی کارروائی کو یہیں تک محدود کر دیا اور اگلے دن شہر جا کر کوئل بانی سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیلیٰ مجنوں کا ڈرامہ

دوسرے دن تھانے آ کر میں نے چند ضروری کام نمائے اور پھر ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر شہر چلا گیا۔ وہاں جا کر میں متعلقہ علاقے کے تھانیدار سے ملا۔ یہ ایک ہندو تھانیدار تھا۔ اس کا نام ستیش چند تھا۔ بڑا سختی تھانیدار تھا لیکن اس میں ایک خرابی تھی کہ جہاں موقع ملتا تھا رشوت لینے سے نہیں چوکتا تھا۔ میری اس بڑی آؤ بھگت کی۔ میں نے اسے اپنا کام بتایا تو اس نے اسی وقت اپنے سکھ اے ایس آئی کو میری مدد کے لیے ساتھ کر دیا۔

اس سکھ اے ایس آئی کا نام ترلوک سنگھ تھا۔ اس کی شکل سے اور بات کرنے کے انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا اور وہ اجڑا اور جنسی قسم کا انسان ہے اور تھانے آنے والے مظلوموں کے لیے کسی جلا دے کم نہیں ہوگا اس کی باتوں سے یہ تو فی اور حماقت بھی نیکی تھی مختصر ایوں سمجھ لیں کہ وہ بہت ہی ”سکھ“ تھا۔

میں اس کی رہنمائی میں اس علاقے میں چلا گیا جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں۔ دن کے گیارہ بارے بجے کا وقت تھا اور وہاں ایسی خاموشی تھی جیسے سب مر گئے ہوں۔ ترلوک سنگھ کے ساتھ میں کوئل بانی کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ ترلوک نے آگے بڑھ کر کسی کا نام لے آواز دی۔ کوئل باہر نہ نکلا تو ترلوک سنگھ نے زوردار آواز سے دروازہ بچایا اور گھبراہٹ کر آواز لگائی۔ تھوڑی دیر بعد ایک پہلوان نما نو جوان آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔

دو باوردی پولیس والوں کو دیکھ کر وہ چونک گیا اور

زبردستی روکنے کی کوشش کی مگر خود کوشی کر لے گا۔ آپ کی چاقو والی بات بھی ٹھیک ہے۔ اس کے پاس ہر وقت چاقو ہوتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ یہ چاقو اپنے سینے میں نہ اتار لے۔

”مجھے تلجرام پر بہت غصہ آیا۔ وہ میرے ساتھ بار بار جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے چاقو کے بارے میں بھی جھوٹ بولا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اب اگر اس نے مجھ سے جھوٹ بولا یا کوئی بات چھپائی تو میں اسے پولیس کو سمجھا کرے اور جرم پر پردہ ڈالنے کے الزام میں گرفتار کر لوں گا۔

اس کے بعد میں نے تلجرام سے اپنے کام کی باتیں پوچھیں اور ضروری کارروائیوں کے بعد تھانے آ گیا۔ تھانے میں آ کر میں کیس کے بارے میں غور کرنے لگا۔ میرے مفروضے کے مطابق دیارام کوئل بانی پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا تھا اور کسی قیمت پر اسے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کوئل بانی کا کوئی اور بھی ایسا ہی چاہنے والا ہو اور کوئل بانی کی وجہ سے ان دونوں میں دشمنی ہو گئی ہو۔ مخالف فریق نے دیارام کا پولورام کر دیا۔ اب میں نے یہ معلوم کرنا تھا کہ کوئل بانی کا ایسا دوسرا عاشق کون ہے۔ اس کے لیے کوئل بانی سے ملنا ضروری تھا۔

دوسری طرف ابھی تک جو ہر غلطی کا کیس کسی کروٹ نہیں بیٹھا تھا۔ کہ یہ نیا نقل میرے گلے پڑ گیا تھا۔ بہر حال میں نے اپنے اے ایس آئی کو جو ہر غلطی کے کیس کے متعلق کچھ ہدایات دے کر اسے اس کیس پر لگا دیا تھا اور زیادہ توجہ دیارام کے کیس پر مرکوز کر دی۔ ویسے دونوں کیسوں کی طرف میں نے دھیان رکھنا تھا۔

دیارام کی پوشا رٹم رپورٹ آگئی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ چاقو یا خنجر کا گہرا اور دل تک چلا گیا تھا اور اس سے لگائی گئی تھی۔ جسم پر اور کسی قسم کا ضرب کا نشان نہیں

ہوا کر رہا تھا۔ کوئل نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اور تھوڑا جھٹک کر ہمیں سلام کیا۔ یہ طوائفوں کا خاص انداز تھا۔

کوئل میری توقعات کے برعکس نکلی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی نوخیز لڑکی ہوگی جس پر دیارِ ام جیسا نوجوان مر مٹا، لیکن وہ میرے اندازے کے مطابق بچیس بچیس برس کی ہوگی۔ اس کے چہرے اور جسم کو دیکھ کر اس کی صحیح عمر کا اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا۔ میں تھانیدار تھا۔ میری اور عام آدمی کی نظروں میں بڑا فرق تھا۔ ویسے بھی کوئل ہائی اس وقت میک اپ کے بغیر تھی۔ رات کو میک اپ اور تیز روشنیوں کی چکا چوند میں اس کا حسن کچھ اور ہی قیامت ڈھاتا ہوگا۔ ویسے عمر سے قطع نظر اس میں غضب کی کشش تھی۔ ورنہ اس نے پہلے کئی طوائفوں کو تعیش کے دوران میک اپ کے بغیر دیکھنے کا تجربہ کچھ اچھا نہ تھا۔

کوئل نے چائے پانی کے لیے پوچھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے پوچھا کہ وہ ہمارا کیا خدمت کر سکتی ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اس کے پاس دیارِ ام نامی ایک نوجوان آتا تھا، میں اس کے متعلق بات کرنے آیا ہوں۔

”ہاں، وہ بڑا پیار آدمی ہے۔“۔۔۔ کوئل نے کہا۔ ”کچھ دنوں سے نہیں آیا۔“

”کیا وہ تمہارا باقاعدہ گاہک تھا؟“۔۔۔ میں نے پوچھا۔

”ایسا نہ کہیں سرکار!“۔۔۔ کوئل ہائی نے چونک کر کہا۔ ”وہ میرے لیے گاہک نہیں ہے۔“

”وہ تا سبھ اور کسں تھا؟“۔۔۔ میں نے کہا۔ ”تم نے اسے اپنے ناز و انداز میں پھانسی رکھا ہوگا۔“

وہ ایک دم تڑپ گئی مگر اس نے کہا۔ ”آپ دیارِ ام کے لیے تھا“ کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہیں؟“

”گھبرا کر ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کیا اور اندر لے جا کر ایک سچے چائے کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ اس نے چائے پانی کے لیے پوچھا تو میں نے منع کر دیا۔

”حکم سردار جی؟“۔۔۔ اس پہلوان نے ترلوک کی طرح دیکھ کر کہا۔ وہ غالباً ترلوک سنگھ کو پہلے سے جانتا تھا۔ ایسے لوگوں کا پولیس والوں سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔

”کوئل ہائی کو بلاؤ۔“۔۔۔ ترلوک سنگھ نے رعب سے کہا۔ ”صاحب نے کچھ پوچھ چکے کرنی ہے۔“

”ہائی تو ابھی سو رہی ہے۔“۔۔۔ اس پہلوان نے کہا۔ ”رات کو دھند ابھرت تھا اس لیے۔۔۔“

”اوئے اٹھا اس خوشی کو۔“۔۔۔ ترلوک نے انتہائی نگلی گالی دے کر کہا۔ ”اسنے جوتے ماروں گا کہ مفرناک کے راستے بہہ جائے گا۔ ہم سرکاری کام سے آئے ہیں کوئی تمہارے بچے کو نوکر ہیں کہ اس کے اٹھنے کا انتظار کریں۔“

وہ پہلوان کان دبا کر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آیا اور بتایا کہ ہائی کو ٹھہرا دیا ہے، تھوڑا انتظار کریں۔ وہ تیار ہو کر ابھی آتی ہے۔

پہلوان کی بات سن کر ترلوک سنگھ کا پارہ پھر چڑھ گیا۔ وہ پھر سکھوں والی نگلی گالیاں بکنے لگا۔

”ہم اس کے کمرے میں جائیں گے۔“۔۔۔ ترلوک سنگھ نے کہا۔ ”ہم تعیش کرنے آئے ہیں، مگر اسنے نہیں آئے کہ وہ تیار ہو کر آئے گی۔“

پہلوان پریشان ہو کر ترلوک سنگھ کا منہ ٹکٹے لگا۔ وہ پھر اندرونی حصے کی طرف چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد آ کر کہنے لگا، اندر آ جائیں۔ ہم اس کی رہنمائی میں چلتے ہوئے ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ پہلوان نے دروازے پر دستک دی اور پھر ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ہم اندر چلے گئے۔ بڑی خوبصورت سے سجا



تھا..... میں اسے جینا ہی سمجھتی تھی۔ پھر اس کی پٹلی بندھ گئی۔

کول بانی بار بار مجھے حیران کر رہی تھی میں نے اس سے کہا کہ وہ پوری بات سنائے کہ وہ دیارام کو گاہک کی بجائے اپنے بیٹا کیوں سمجھتی تھی اور کیا دیارام بھی اسے ماں سمجھتا تھا؟

”وہ بد نصیب میرا گاہک بن کر آتا تھا۔“ کول بانی نے دھکی لکھے میں کہا۔ ”میرے اوپر دوسروں کی طرح نوٹ پھینکتا تھا۔ مجھے اس کے نوٹ پھروں کی طرح لگتے تھے۔ میں اسے نوٹ پھینکنے سے منع کرتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ میں دوسروں کو کیوں منع نہیں کرتی..... ایک بار اس نے جذباتی ہو کر مجھے اپنی ہانہوں میں بھر لیا تو میں نے اسے پھڑ مار دیا.....“

کول بانی نے بڑی لمبی بات سنا دی۔ میں آپ کو مختصر کر کے اپنے الفاظ میں کول کی کہانی سنا دیتا ہوں۔

دو بیٹے، دونوں حرامی دیارام پہلی بار کول کے کوٹھے پر آیا تو یہ بھولا بھالا نوجوان اس کے دل کو بہت اچھا لگا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کسی عزت دار گھرانے کا شریف سالاکا ہے۔ کول اس پر خصوصی توجہ دینے لگی۔ دیارام بھی غائبانہ کاتر سا ہوا تھا۔ وہ کول کے ساتھ دل کی باتیں کرتا تھا۔ اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی تھی لیکن دیارام کے ساتھ قماش بیٹنیا والا رویہ رکھتا تھا۔

یہاں میں نے کول سے پوچھا کہ وہ دیارام کو اپنے بیٹے کی طرح کیوں سمجھتی تھی جبکہ وہ اس کے لیے اچھا خاصا منافع بخش گاہک تھا۔

کول نے بتایا کہ جب اس کی عمر سولہ سال کی تھی تو اس کی تھ اتروانی کی رسم ادا کی گئی۔ اس کا پہلا گاہک انتہائی دولت مند آدمی تھا اور اس نے منہ مانگی قیمت دی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کو:

میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں بتایا تھا کہ دیارام کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میں کسی مناسب موقع پر یہ انکشاف کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے اصل بات بتا دوں۔

”دیارام کو کل رات کسی دشمن نے قتل کر دیا ہے۔“ میں نے اسے بتا دیا۔

وہ ایک دم لرز کر رہ گئی اور ایسی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے تہہ روی ہو کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔

”میں اس کے قتل کی تحقیق کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔“ میں نے اپنی بات مکمل کی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کول بانی کی خوبصورت آنکھوں سے مونے مونے آنسو بہنے لگے اور پھر وہ ہچکیاں لے لے کر رہنے لگی۔ میں اور ترلوک سنگھ حیران ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگے۔ یہ طوائفیں تو صرف پیسے سے محبت کرتی ہیں۔ ان کی نظر گاہک کی جیب پر ہوتی ہے۔ جب تک جیب بھری رہے یہ پاس رہتی ہیں اور جیب خالی ہوتے ہی دھتکار دیتی ہیں۔ کول بانی کا یہ روپ ہم دونوں کے لیے نرالا اور نئے سمجھ میں آنے والا تھا۔

میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے دیارام اور کول بانی ایک دوسرے سے جی محبت کرنے لگے ہوں۔ کول یہ پیشہ چھوڑنا چاہتی ہو۔ ایسے کئی واقعات ہوئے تھے کہ کوئی طوائف دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے کسی چاہنے والے کا بچے کے ساتھ بھاگ گئی ہو۔ مجھے اس غصہ آنے لگا کہ اس نے اپنے سے بہت چھوٹی عمر کے لڑکے کو پھاس رکھا تھا۔

”یہ سبلی جمنوں کا ڈرامہ بند کر دو۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”وہ تمہارے بیٹے کی عمر کا تھا۔“

”آپ نے بالکل ٹھیک کہا سرکار!“ اس نے رنجی ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ میرے بیٹے کی عمر کا

یقین ہے کہ وہ تاجناز اولاد ہے۔ اس کے جواب میں دیارام نے بتایا کہ گاؤں کا ایک آدمی اس کے باپ کی غیر موجودگی میں اس کی ماں سے ملتا تھا۔ چھوٹی عمر میں تو اسے پتہ نہ چلا کہ یہ اچھی بات ہے یا بری۔ جب وہ جوان ہوا تو اس بات کو سمجھنے لگا۔ اب وہ آدمی اس کی ماں سے نہیں ملتا تھا۔ ان کی ملاقاتیں اب نہ ہونے کے برابر تھیں۔

ایک رات جب تلجارام کسی کام سے گیا ہوا تھا اور گھر میں دیارام اور اس کی ماں ہی تھیں۔ رات کے کسی وقت دیارام کی آنکھ کھلی گئی۔ وہ اوپر والے کمرے میں سوتا تھا۔ اسے ماں کے کمرے سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دبے قدموں نیچے اترا۔ کوئی مرد تھا جو اس کی ماں سے باتیں کر رہا تھا۔

اس روز ان کی باتیں سن کر اس پر انکشاف ہوا کہ وہ حرام کی اولاد ہے اور اس کا باپ تلجارام نہیں بلکہ یہ شخص ہے۔ اس شخص نے کسی طرح دیارام کی ماں کو بھانسا لیا تھا اور اب اسے بلیک میل کر رہا تھا کہ اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس کی ماں اس آدمی منت سماجت کر رہی تھی کہ وہ اتنے زیادہ پیسوں کا انتظام نہیں کر سکتی۔ وہ اس پر رحم کرے اور اس کا بسا بسا یا گھر برباد نہ کرے۔ وہ آدمی دھمکیاں دے رہا تھا کہ سارے گاؤں میں نمبر دار کی عزت کا جنازہ نکال دے گا۔

دیارام کو اس آدمی پر بہت غصہ آیا اور اس کا پیچھا کیا۔ وہ اسی وقت اس آدمی کا گامھونت دے مگر پھر وہ ان خیال سے آگے نہ گیا کہ اس طرح اس کی ماں ساری عمر اس کے آگے شرمندہ رہے گی۔ دیارام نے اس آدمی کو قتل کرنے کا پکارا وہ کر لیا تھا۔ وہ صرف موقع کی تلاش میں تھا۔

”اپنے اس پہلو ان سے میرا کام کیا؟“

”ساری بات سنا کر دیارام نے کوئل سے کہا۔

یعنی کی شکل بھی نہیں دکھائی گئی اور کہیں غائب کر دیا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتبہ پھر اسے کنواری ظاہر کر کے کسی دولت مند سے بھاری رقم آٹھنی جاسکے۔

کوئل نے بتایا ہمارے ہاں بھائی کھاتے پیتے ہیں، خوب جان بٹاتے ہیں اور پہلوانی کرتے ہیں اور اگر کوئی تماش بین غنڈہ سردی کرے یا بد معاشی پر اتر آئے تو اس سیدھا کر دیتے ہیں۔ جو پہلو ان ہمیں اندر لے کر آیا تھا، وہ کوئل کا۔ گابھائی تھا۔

کوئل نے دیارام کو دیکھا تو اسے اپنا بیٹا یاد آ گیا وہ اس کے ساتھ کچھ اور طرح کا پیار کرنے لگی مگر دیارام اس کے ساتھ اوجھی حرکتیں کرتا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اس کردار کا لڑکا نہیں ہے، بس جان بوجھ کر ایسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک بار تہائی میں اس نے کوئل کے ساتھ لپٹنے کی کوشش کی تو کوئل نے اسے زوردار تھپڑ مار دیا۔ اب اس کے جواب میں دیارام نے بھی پوری قوت سے اسے جوانی تھپڑ مارا۔

یہ مردانہ ٹھپڑ تھا اور اس قدر زوردار تھا کہ کوئل کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ چیخ کی آواز سن کر اس کا پہلو ان بھائی آ گیا۔ وہ دیارام کی مرمت کرنا چاہتا تھا لیکن کوئل نے اسے روک دیا۔ پھر کوئل نے اس سے پوچھا کہ وہ غلیظ، بن کا آدمی نہیں ہے پھر ایسی حرکتیں کیوں کرتا ہے۔ اس کے جواب میں دیارام کے آنسو نکل آئے۔

”میں غلیظ نہیں ہوں۔۔۔ اس نے کوئل سے کہا۔“ لیکن غلاظت کی پیداوار تو ہوں۔۔۔ میں اپنے باپ کا نہیں ہوں۔۔۔ میری ماں نے مجھے چور دروازے سے پیدا کیا ہے۔ میرا وجود تاجناز ہے، میں حرامی ہوں۔ پھر میں نیک شریف بن کر کیوں رہوں۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ سب مجھ سے نفرت کریں۔ مجھے دھکا دیں۔۔۔ تمہارے کوٹھے پر بھی اسی وجہ سے آتا ہوں۔“

کوئل نے دیارام سے پوچھا کہ اسے کس طرح

”جہیں کس نے کہا ہے کہ میں تمہاری ماں کو بلیک میل کرتا ہوں؟“۔ جوہر علی نے گھبرا کر پوچھا۔  
 ”میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔“  
 دیارام نے کہا۔ ”اس رات میں نے چپ کرساری باتیں سن لی تھیں۔“

دیارام نے جوہر علی پر چاقو کا وار کیا جو وہ پھرتی سے بچا گیا۔ دیارام پر تو جنون سوار ہو چکا تھا۔ وہ اندھا دھند چاقو چلانے لگا۔ جوہر علی بڑی مشکل سے بچ رہا تھا۔

”سنو دیارام!“۔ جوہر علی نے کہا۔ ”اگر تم نے ساری باتیں سن لی ہیں تو پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ کیا اپنے باپ کو قتل کر دو گے؟“

”تم مجھے حرام طریقے سے اس دنیا میں لانے کا باعث بنے ہو۔“ دیارام نے کہا۔ ”میں نے تم سے نفرت کرتا ہوں، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“  
 دونوں میں لڑائی ہونے لگی۔ اب جوہر علی کی کوشش تھی کہ وہ دیارام سے چاقو چھین لے۔ وہ چاقو کے واروں سے بچتا ہوا پیچھے ہٹ رہا تھا کہ اچانک اس کے پیچھے، فصل کے اندر سے ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس آدمی نے دونوں بازو کھولے، چادر کے کنارے اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اس وقت وہ کسی دیکر چمکاؤ کی طرح لٹک رہا تھا جو پھیلانے کھڑی ہو۔ اس آدمی نے جوہر علی کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ جوہر علی اپنے آپ کوک اس سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس گرفت مضبوط تھی۔

ادھر دیارام جنون کی حالت میں تھا، اس نے یہ سوچنے کی بجائے کہ جوہر علی کو پکڑنے والا کون ہے، جوہر علی کے پیٹ میں چاقو ٹھونپ دیا۔ جوہر علی کے منہ سے ”ہائے“ کی آواز نکل گئی مگر دیارام پاگل ہو چکا تھا۔

”کون سا کام؟“۔ کوئل نے پوچھا۔  
 ”اسی آدمی کو قتل کرنا ہے۔“ دیارام نے کہا۔  
 ”جتنے پیسے لگیں گے، میں دے دوں گا۔“  
 کوئل نے اسے کو کہا کہ وہ اس کا کام کرا دے گی وہ حوصلہ رکھے۔

یہاں پر میں نے کوئل سے پوچھا کہ دیارام جس آدمی کو قتل کرانا چاہتا تھا۔ اس نے اس کا نام کیا بتایا تھا۔  
 ”جوہر علی۔“ کوئل نے یاد کرتے ہوئے کہا۔  
 ”ن کا مطلب ہے جوہر علی کو تم نے اپنے پہلوان بھائی سے قتل کرایا ہے۔“ میں نے کوئل سے کہا۔  
 ”نہیں، یہ غلط ہے۔“۔ کوئل نے کہا۔  
 ”دیارام نے یہ کام خود ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جوہر علی کو دیارام اور اس کے باپ نے قتل کر لیا تھا۔  
 دیارام نے کوئل کو تفصیل سنائی تھی۔

دیارام نے لمبے پھل والا ایک چاقو خرید لیا تھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ آخری ایک دن اس نے جوہر علی سے کہا کہ اس کی ماں نے رات کو ظلم جگہ کھیتوں میں اسے بلایا ہے۔ جوہر علی یہ سن کر خوش ہو گیا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ کانٹے اس کے لیے پیسوں کا بندوبست کر لیا ہے۔ رات کو جب جوہر علی دیارام کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو دیارام وہاں پہلے سے موجود تھا۔ جوہر علی دیارام کو وہاں دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اس سے پوچھا کہ اس کی ماں کیوں نہیں آئی۔  
 ”دیارام خاموش رہا اور کچھ نہ بولا۔

”کیا تم میرے لیے پیسے لے کر آئے ہو؟“۔  
 جوہر علی نے دیارام سے پوچھا۔

”میں پیسے نہیں، موت لے کر آیا ہوں۔“ دیارام نے غصے کے عالم میں کہا۔ ”تم میری ماں کو بلیک میل کرتے ہو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“۔ یہ کہہ کر دیارام نے چاقو نکال لیا۔



”ایسی کوئی بات نہیں“۔ کوئل بائی نے کہا۔  
 ”اس کا یہاں کسی بھی گاہک کے ساتھ جھگڑا نہیں ہوا۔ وہ میرے بیٹے جیسا تھا اور میں اس کا ایک ماں کی طرح رکھتی تھی“۔ پھر اس نے ذرا توقف کر کے کہا۔  
 ”آپ میری مائیں تو دیارام کے قاتل کو گاؤں میں ہی تلاش کریں“۔

اس کی بات میرے دل کو لگی کہ اگر اس کا یہاں کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا پھر قاتل کو گاؤں کا ہی کوئی آدمی ہونا چاہئے۔ میں نے کوئل کے تعاون پر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر اس کے بیان کی ضرورت پڑی تو اسے عدالت میں یہی بیان دینا ہوگا۔

اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ وہ اپنے بیٹے کے قاتل کو سزائے موت دلانے کے لیے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہے۔ میں نے اس سے کچھ اور باتیں پوچھیں اور پھر میں تڑوگ ٹکھ کو ساتھ لے کر وہاں سے آ گیا۔

میں اپنے قاتلے واپس آ رہا تھا اور میرا ذہن بڑی تیزی سے سارے حالات و واقعات پر غور کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں بہت کچھ واضح ہونے لگا تھا۔

میں نے قاتلے پہنچنے ہی جو ہرملی کے قتل کا کیس تیار کرنا شروع کر دیا۔ کوئل بائی کا بیان بھی شامل کر دیا۔ اب میں نے نمبردار دیارام کو اعانت قتل اور جرم چھپانے کے الزام میں گرفتار کرنا تھا۔

میں نے جب دیارام کی لاش دیکھی تھی تو یوں محسوس ہوا تھا کہ کوئی چیز میرے ذہن میں چھ رہی ہے جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کوئل کے بیان کے بعد وہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی جو چیز میرے ذہن میں اس وقت چھ رہی تھی، وہ یہ تھی کہ دیارام کے چہرے کے نقوش منتقل جو ہرملی سے بڑی مشابہت رکھتے تھے۔ اس کا قد کاٹھ اور رنگ روپ بھی جو ہرملی پر گیا تھا، کیونکہ جاتا

ہیں نے چاقو کے کئی وار جو ہرملی پر سکے۔ اس دوران اسے پکڑنے والے آدمی نے اسے چھوڑا نہیں۔ جب زیادہ خون بہہ جانے سے جو ہرملی پر فشی طاری ہونے لگی تو اس آدمی نے اسے چھوڑ دیا۔ جو ہرملی بچ کر بڑا۔

تب دیارام نے اس آدمی کی طرف دیکھا، اور وہ حیران رہ گیا۔ وہ اس کا باپ تلجارام تھا۔ تلجارام نے دیارام سے کہا کہ یہاں سے فوراً اٹھو، کہیں کوئی نہیں دیکھ نہ لے۔ دونوں باپ بیٹا گھر پہنچ گئے۔ تلجارام نے بیٹے سے خون آلود چاقو لے کر اسے اچھی طرح دھو کر اپنے پاس رکھ لیا۔ پھر دونوں نے اپنے کپڑے دھوئے اور آرام سے لیٹ گئے۔

”دیارام میرے ساتھ ہر بات کر لیتا تھا“۔ ساری بات سنا کر کوئل بائی نے کہا۔ ”اسے قتل کے بعد اگلے دن ہی مجھے یہ ساری بات سنا دی تھی۔ اب آپ سے سنا ہے کہ دیارام کو کبھی کسی نے قتل کر دیا ہے۔۔۔۔۔ آج میرا بیٹا زندہ ہوتا تو وہ بھی دیارام جیسا ہوتا، دونوں حرام کی موت مر گئے۔ دونوں بد نصیب حرامی تھے۔“

اس کے ساتھ ہی کوئل کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ دو ایسے بیٹوں کے لیے رونے لگی جو اس دنیا میں چور دروازے سے آئے تھے اور دنیا والوں نے انہیں اسی دروازے سے واپس بھیج دیا تھا۔

اس طوائف نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا تھا اور جو ہرملی کے قتل کا سراغ مل گیا تھا۔ اب ایک اور مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا اور وہ یہ کہ جو ہرملی کا قاتل خود بھی قتل ہو گیا اور مجھے اس کے قتل کا سراغ لگانا تھا۔

میں نے کوئل بائی سے پوچھا کہ یہاں اس اس کے کوٹھے پر بھی دیارام کا کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو وہ مجھے بتادے، اس طرح قاتل کو پکڑنے میں آسانی ہوگی۔

آخروہ جو ہر علی کا بیٹا تھا، ناجائز ہی تھی۔

اب ان غلطوٹ پر سوچ رہا تھا کہ دیارام کو کون قتل کر سکتا ہے۔ ایک شک متقول جو ہر علی کے بیٹے مظہر علی پر ہوتا تھا کہ اسے کسی طرح یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس کے باپ کو دیارام نے قتل کیا ہے۔ اس نے اپنے باپ کا انتقام اپنے ہاتھ سے لے لیا ہو۔ دوسرے نمبر پر جو شخص مشتبہ تھا وہ تلجارام تھا۔ اس کے پاس بھی قتل کی وجہ موجود تھی کہ دیارام اس کا جائز بیٹا نہیں تھا بلکہ وہ ایک مسلمان کا خون تھا۔

پھر میرے ذہن میں تلجارام کے خون آلود کپڑے اور اس کے کرتے کا ٹوٹا ہوا ٹین آگیا جو متقول دیارام کے کمرے سے ملا تھا۔ اس وقت یہ صورت حال نہیں تھی جو اب میرے سامنے آگئی تھی، اس لیے میرے ذہن میں ایسا شک نہ ابھرا کہ باپ بیٹے کو قتل کر سکتا ہے۔

تلجارام کے حق میں یہ بات جاتی تھی کہ اگر وہ دیارام کو قتل کرنا چاہتا تو اسی رات جب جو ہر علی قتل ہوا تھا، وہ دیارام کو بھی ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

میں جتنا زیادہ سوچتا گیا، اتنا ہی میرا دماغ الجھتا رہا۔ میرے اوپر بھنبلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے جو ہر علی کے قتل کے سلسلے میں تلجارام کو گرفتار کرنا ہی تھا، اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلے تلجارام کو تشکیش کی جگہ میں ڈالوں گا اور اگر اس نے دیارام کے قتل کا اقرار نہ کیا تو پھر متقول جو ہر علی کے بیٹے مظہر علی کو گرفتار دوں گا۔

یہی سوچ کر میں نے نمبردار تلجارام کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا میں نے اپنے اے ایس آئی کو کہا کہ وہ تلجارام کو تھانے لے کر آجائے اور یہ نہ کہے کہ اسے گرفتار کیا جا رہا ہے، بس اسے کہے کہ تھانہ دار نے بلایا ہے۔ اے ایس آئی ایک کانٹیل کے ساتھ چلا گیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد وہ کانٹیل جو اے ایس آئی

کے ساتھ گیا تھا، وہ واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ نمبردار تلجارام کی بیوی صبح سویرے سکتے کی حالت میں جل بسی ہے اور اب اس کے کرایا کرم کا انتظام ہو رہا ہے۔ اے ایس آئی نے پیغام بھجوایا تھا کہ وہ کانٹا دیوی کے کرایا کرم سے فارغ ہونے کے بعد تلجارام کو ساتھ لے کر آجائے گا۔

یہ اس کیس کی تفتیش کے دوران تیسری موت تھی۔ دیارام اگرچہ اس کی ناجائز اولاد تھا مگر اس نے بیٹے کی موت کا اتنا زیادہ صدمہ لیا تھا کہ جان سے گزر گئی۔

ایک چاقو دو قتل

شام پانچ بجے کے لگ بھگ اے ایس آئی تلجارام کو ساتھ لے کر تھانے آگیا۔ میں نے اس کے ساتھ رکی طور پر اس کی بیوی کے مرنے پر افسوس کا اظہار کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”سب کچھ تباہ ہو گیا سرکار!“۔ تلجارام نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔۔۔ ”اب میں زندہ رہ کر کیا کروں گا؟“

میں نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور خودکشی کی طرف مائل ہے۔ یہ صورت حال میرے لیے سازگار تھی۔ میں باتوں باتوں میں جو ہر علی کے قتل کی طرف آگیا۔ پھر میں نے اس سے کہا کہ مجھے تمام بات معلوم ہوگئی ہے کہ متقول جو ہر علی کو دیارام اور اس نے قتل کیا ہے اور یہ کہ مجھے شک ہے کہ اپنے بیٹے دیارام کو بھی اسی نے قتل کیا ہے۔

”تم خود بیان دو گے یا میں سارا واقعہ بیان کروں؟“۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اگر خود بیان دے دو گے تو میں تمہارے ساتھ رعایت کروں گا اور کس نرم بنائوں گا۔“

”میں کسی قسم کی رعایت نہیں لینا چاہتا۔“۔

تلجارام نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ میرا

## نیت

کتنی بھی اچھی ہو، دنیا آپ کو آپ کے دکھاوے سے جانتی ہے..... اور دکھاوے کا کتنا بھی اچھا ہو، اللہ آپ کو آپ کی نیت سے جانتا ہے۔

کی خبر پھیل گئی تو کانتا سمجھ گئی کہ جو ہر علی کو کس نے قتل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کانتا کے دل میں یہ بات آئی کہ اس کا بھید کھل گیا ہے کہ دیارام اس کے اور جو ہر علی کے گناہ کا نتیجہ ہے۔ وہ باپ بیٹے کا سامنا کرنے سے کترانے لگی۔ دوسری طرف تلجارام نے اس سے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہ کہا لیکن کانتا بڑی حساس تھی۔ وہ اولاد کی خواہش میں ایک گناہ کر بیٹھی تھی اور اب اس انکشاف کے بعد کہ اس کے خاوند اور بیٹے پر اس کا گناہ کھل چکا ہے، وہ دونوں کا سامنا کرنے سے اکثرانے لگی۔

آخر تلجارام نے اس سے کھل کر بات کی کہ جو کچھ ہو چکا ہے، وہ اسے بھول جائے، اسے اس سے کوئی شکایت نہیں۔

”تم نے تو مجھے معاف کر دیا ہے۔“ کانتا نے تلجارام سے کہا۔ ”لیکن بیٹا کبھی معاف نہیں کرے گا۔ وہ جن نظروں سے دیکھتا ہے، میرا جی چاہتا ہے انہی قدموں پر کھڑی کھڑی مر جاؤں۔ ایک ماں کے لیے اس سے بڑی ذلت اور کیا ہوگی کہ اس کے بیٹے کو ظلم ہو کہ اس کی ماں نے اسے چور دروازے سے پیدا کیا ہے وہ جب بھی میرے سامنے آئے گا، میری موت ہوگی۔ میں رات رات میں کتنی بار مرتی ہوں، یہ کوئی نہیں جانتا..... اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ بھگوان! مجھے موت دے دے۔“ اس کے بعد کانتا بلک بلک کر رونے لگی۔

ایک بار کانتا خود کشی کرنے لگی مگر تلجارام نے

اقبال بیان لکھ لیں کہ جو ہر علی کو اور دیارام کوئی نے قتل کیا ہے۔ مجھے پھانسی پر لٹکا دیں۔“ اس کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کہتے ہیں چیزیں اور درد، یہی صورت حال میرے ساتھ تھی۔ کہاں میں ایک قتل کا سراغ لگانے کے لیے پریشان ہو رہا تھا اور کہاں دونوں کیسوں کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

تلجارام نے بڑی تفصیل سے بیان دیا تھا۔ میں اس کا بیان اپنے الفاظ میں سنا دیتا ہوں۔ جس رات دیا رام نے متوکل جو ہر علی کو قتل کرنے کے لیے کھیتوں میں بلایا تھا اور زخموں کو قتل کرنے کے لیے رات کو گھر سے نکلا تو اتفاق سے تلجارام نے اسے دیکھ لیا اور چوری چھپے اس کا پیچھا کرتے ہوئے موقعہ واردات تک پہنچ کر فصل میں چھپ گیا۔ پھر دیارام اور جو ہر علی کی باتوں سے اس پر انکشاف ہوا کہ دیارام دراصل اس کا بیٹا نہیں بلکہ اس کی بیوی نے اس کو دھوکہ دے کر جو ہر علی کے ساتھ تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اسی کے نتیجے میں دیارام پیدا ہوا۔

اس کا خون اگلنے لگا۔ اس نے جو ہر علی کو پیچھے سے اچانک دیوچ کر دیارام کو موقع دیا کہ وہ چاقو کے وار کرے۔ جب جو ہر علی مر گیا تو وہ دیارام کو ساتھ لے کر گھر آ گیا۔ چاقو دھویا پھر کپڑے دھوئے۔ اس کی بیوی کانتا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے نہیں علم تھا کہ دونوں باپ بیٹا کیا کر آئے ہیں۔

تلجارام کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جو بھی ہوا وہ اسے بھول جائے گا اور اپنی بیوی کو معاف کر دے گا اور دیارام کو بیٹے کی جگہ قبول کر لے گا۔ وہ غیادی طور پر شریف آدمی تھا اور حالات سے سمجھ کر نہ کرنا چاہتا تھا۔

لیکن اگلی صبح جب پورے گاؤں میں جو ہر علی کے قتل



دیتے تھے کہ ان کے علم میں یہ بات آئی کہ پولیس نے نمبردار کو اپنے بیٹے کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے تو وہ بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ پولیس والوں کو فطرتی لگی ہے، اصل قاتل جلد ہی سامنے آجائے گا۔

میں نے تھانے پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ بھوپندر جس کو قتل میں تھانے بٹھارکھا تھا، مگر جانے کی اجازت دے دی اور سختی سے کہا کہ وہ آئندہ جو آئے نہ کھیلے۔ وہ میرا شکر یہ ادا کر کے چلا گیا۔

میں نے تمام ضروری کارروائیاں کرنے کے بعد کیس عدالت میں پیش کر دیا۔ تلجیارام نے اپنی طرف سے کوئی وکیل نہ کیا تھا۔ اسے عدالت کی طرف سے وکیل مہیا کیا گیا مگر تلجیارام اپنے اقبالی بیان پڑھتا رہا۔ اس کیس میں کوئی چیلنج کی نہیں تھی۔ جج نے تلجیارام کو اس کے حالات کی وجہ سے صرف سات سال سزائے قید با مشقت سنائی۔

ایک صبح میں بڑے خوشگوار موڈ میں تھانے بیٹھا تھا، جو ہر علی اور دیارام کے قتل کے کیس نمٹ گئے تھے اور میں خود کو بڑا ہلکا چمکا محسوس کر رہا تھا۔ اچانک میری نظر باہر کی طرف پڑی تو بھوپندر سنگھ نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تلخی کرپان تھی۔ وہ سپید حابیری طرف آیا۔ میں نے دیکھا، کرپان خون آلود تھی۔

”لو جی سرکار!“ اس نے کرپان میری میز پر رکھ کر کہا۔ ”جی سرکار اقبالی بیان منگدے سی۔“ میں لکھ لو۔ میں اپنی دھرم پتی ریتی کو روکے ہوئے کرا یاں!“ بھوپندر سنگھ نے بڑے غصے سے میری طرف دیکھا اور میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

یہ دو ہفتوں کے دوران چوتھی لاش تھی جس کا میں سامنا کرنے والا تھا۔



محبت دیکھ لیا اور اسے بھالیا۔ وہ محبت کے چہرے سے چھوڑ ڈال کر تلخی کی تیاری کر رہی تھی۔

تلجیارام کو کاٹتا سے جی محبت تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اچانک اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ سارے فساد کی جڑ دیارام ہے۔ اگر دیارام نہ ہو تو سارا فساد ختم ہو جائے گا۔ یوں بھی وہ ناچنا تھا اور ایک مسلمان کا خون تھا۔ جوں جو تلجیارام سوچتا گیا، اس کے دماغ پر خون سوار ہوتا گیا۔

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس نے صندوق سے وہ چاقو نکالا جس سے دیارام نے جو ہر علی کا خون کیا تھا اور اس نے وہ چاقو اس سے لے کر دھونے کے بعد سنہال کر رکھ لیا تھا۔ وہ چاقو ہاتھ میں لے کر باہر نکلا اور میز حیاں چڑھتا ہوا دیارام کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا، دیارام پیٹھ کے بل بے خبر سو رہا تھا۔

تلجیارام نے چاقو کا کھکا دکھایا تو اس کا چہرہ اچھل گیا پھل پھر نکل آیا۔ اس نے سوئے ہوئے دیارام کے دل کا نشانہ لیا اور پھر پوری نفرت اور طاقت کے ساتھ وار کر دیا۔ دیارام بری طرح تڑپا، اچھلا لیکن تلجیارام نے چاقو نہ نکالا بلکہ اسے اور زور سے دبائے رکھا۔ دیارام نے اسے دیکھا اور صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ”ہاپو۔۔۔ تم۔۔۔ اچھا کیا۔“

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میں آپ کو پہلے سنا چکا ہوں۔ میں نے تلجیارام کا اقبال بیان قلمبند کر کے اس کے دستخط کرا لئے۔ پھر اس کے ساتھ گاؤں میں جا کر معززین کی موجودگی میں ایک قتل برآمد کیا۔ اس چاقو سے دو انسان قتل ہوئے تھے۔

اس المناک واردات کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ گاؤں کے لوگ تلجیارام کی اتنی عزت کرتے تھے اور اتنی محبت